Registered No. L. 5340

جلد ۲۹
عدد ۳

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے	برائے پاکستان	قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
" سات روپیہ آٹھ آنے	برائے ہندوستان	" گیارہ آنے

فہرست مضامین

جلد ۲۹	شعبان ۱۳۶۵ھ مطابق جولائی ۱۹۴۶ء	عدد ۲

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ۔ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام پٹھان کوٹ
(پنجاب) سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس طرح ایک بیج کے نشوونما پانے کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے اُسی طرح کلمۂ حق کی دعوت میں مجرد حق کی فطری صلاحیتوں ہی پر اعتماد نہیں کر لینا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے وہ حق پیش کیا جا رہا ہے، دعوت کے وقت نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کی حالت کیا ہے؟ زمینوں کی طرح، روحوں اور دلوں کے بھی موسم ہوتے ہیں اور ایک داعی کا فرض ہے کہ ان موسموں سے اسی طرح واقف ہو جس طرح ایک دہقان زمین کی فصلوں اور موسموں کو پہچانتا ہے اور اسی وقت کو بیج ڈالے جب موسم سازگار ہو۔ جو لوگ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں، خواہ اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ حق اپنے ذاتی جوہر اور اپنی فطری کشش سے خود بخود دلوں میں جگہ پیدا کرے گا، اس کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی اس غلطی کی سزا اپنی دعوت کی ناکامی کی شکل میں پاتے ہیں، اور ان کی نیک نیتی ان کی اس بے تدبیری اور غفلت کے نتائج سے ان کو بچا نہیں سکتی جو مخاطب کی نفسیات کی رعایت کے باب میں ان سے صادر ہوتی ہے۔

ایک داعی کو جن مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ان سے ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر جتنے مختلف نوعیت کے معاملے اس کو کرنے پڑتے ہیں ان سب کی تفصیل نہ ممکن ہے اور نہ اس کے لیے یہاں گنجائش ہے لیکن حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے طرز عمل سے یا ان ہدایات سے جو ان کو اس بارہ میں دی گئی ہیں، بعض اصولی باتیں مستنبط ہوتی ہیں جو بطور مثال ہم یہاں بیان کریں گے تاکہ ان کو

پیش نظر رکھ کر ہمارے ارکان، مختلف حالات کے لحاظ سے اپنے لیے طرزِ عمل خود متعین کر سکیں۔ اس چیز کا تعلق درحقیقت عام فہم سے ہے۔ ایک سلیم الطبع اور نیک نیت داعی۔ جو اپنے مقصد کو اچھی طرح پہچانتا ہے اگر ان مثالوں کو پیش نظر رکھے گا تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنے طریق دعوت کو انبیاء کے طریق دعوت سے مشابہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہاں ہم جن اصولی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں وہ درج ذیل ہیں

۱۔ ایک چیز کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ بعض اعتبار سے وہ سہل و آسان ہوتی ہے بعض اعتبار سے مشکل ہوتی ہے۔ کسی مبتدی کے سامنے اگر اس کو اس پہلو سے پیش کیجیے جو سہل ہے تو اس کو اس سے کچھ ایسی اجنبیت اور نفرت نہیں ہوگی، لیکن اگر پہلی ہی ملاقات میں، اس کو دوسرے پہلو سے پیش کر دیجیے تو وہ فوراً اس سے وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوگا اور پھر شاید کبھی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ دین حق کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ بیگانہ سے بیگانہ آدمی کے لیے بھی وہ اپنے بعض پہلوؤں سے دل آویز اور دل کش ہے اور اگر اسی پہلو سے اس کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہو کر اس کے نرم و سخت سب کو قبول کر لیتا ہے لیکن مانوس سے مانوس آدمی بھی اس کے بعض پہلوؤں کو سخت اور گراں محسوس کرتا ہے اور اگر اس کے سامنے اس پہلو سے اس کو پیش کیا جائے تو مزید مانوس ہونا تو الگ رہا اندیشہ اس بات کا رہتا ہے کہ اس کا سابق انس بھی وحشت و اجنبیت سے بدل جائے۔ جو لوگ ایک شے کے مختلف پہلوؤں اور ان کے فرق کو نہیں جانتے یا اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ایک مبتدی کے سامنے ایک شے کا کونسا پہلو سب سے پہلے لانا چاہیے یا طبعاً ان کا مذاق ہی اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ سنگلاخ زمینوں ہی میں طبع آزمائی کرتے اور ہر بات میں تشدد ہی کو کمال دینداری خیال کرتے ہیں، وہ لوگ جب دعوت دین کا کام سنبھالتے ہیں تو ان کی دعوت کا نتیجہ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ لوگ قریب آنے کے بجائے اور دور ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ یہ لوگ دعوت کے لیے جو راہ اختیار کرتے ہیں وہ انسانی نفسیات کے لحاظ سے بالکل الٹی ہوتی ہے، اور اس سے بشارت کی جگہ

نفرت اور انس کی جگہ بیزاری پھیلتی ہے۔ اسی چیز سے روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بشروا ولا تنفروا (خوش خبری دو، لوگوں میں نفرت نہ پھیلاؤ) اور داعیان حق کے لیے صحیح طرز عمل یہ بتایا کہ انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو)

۲۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے دوسری اہم چیز ایک داعی کے لیے قابل لحاظ یہ ہے کہ اسے کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیت جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے۔ ہر داعی حق کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قوم اپنے معتقدات و روایات کے ساتھ کم و بیش اسی طرح کی وابستگی رکھتی ہے جس طرح کی وابستگی ایک داعی حق اپنے معتقدات کے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ وابستگی اگر باطل ہے تو اس کی اصلاح کا راستہ یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جن کی وجہ سے یہ غلط وابستگی قائم ہے اور ان کی اصلاح کو اس وابستگی کے توڑنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ حق پرستی کے جوش یا باطل کی مخالفت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر یہ ہرگز نہ کیا جائے کہ اس غلط وابستگی کے فکری اسباب کی اصلاح کے بجائے خود اس پر براہ راست حملہ کر دیا جائے۔ اس طرح کے براہ راست حملہ کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے (اور یہی ہو سکتا ہے) کہ مخاطب حمیت جاہلیت کے جوش سے مجبور ہو کر دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس جوش میں وہ ایسا اندھا بہرا ہو جاتا ہے کہ جو اینٹ پتھر اسے سامنے مل جاتا ہے وہی اٹھا کر وہ داعی پر پھینک مارتا ہے۔ سورہ انعام میں داعیان حق کو اسی چیز سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ	اور تم نہ گالی دو ان کو جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ
دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ	حد سے گذر کر بے جانے بوجھے اللہ کو گالی دے بیٹھیں۔ ایسی
كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ	ہم نے ہر امت کی نظروں میں اس کے اعمال کھبا دیے ہیں

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک ہدایت قرآن مجید نے یہ بھی دی ہے کہ دعوت حق کے کام کے سلسلہ میں ساری گفتگو اصل مقصد تک محدود رہنی چاہیے اور اگر مخاطب کی طرف سے کوئی ایسا پہلو چھیڑ دیا جائے

جس سے دونوں فریق کے مقتداؤں اور لیڈروں میں ترجیح وتفضیل کا معرکہ کارزار گرم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو داعیان حق کو چاہیے کہ بحث کی غلط رو میں بہ جانے کے بجائے اس کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کریں اور مخاطب کے لیڈروں اور مقتداؤں کی تحقیر کے بجائے ان کے لیے اس عزت و احترام کا اعتراف کریں جس کے وہ واقعی طور پر مستحق ہیں۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ	اور میرے بندوں سے کہو وہ بات کہیں جو بہتر ہے۔
اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ اِنَّ الشَّيْطٰنَ	شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ بے شک
كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا. رَبُّكُمْ اَعْلَمُ	شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ تمھارا رب تم کو خوب جانتا ہے
بِكُمْ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ	اگر چاہے گا تم پر رحم کرے گا اور اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا. وَرَبُّكَ	اور ہم نے تم کو ان کے ایمان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔
اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَقَدْ	اور تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں
فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا	اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے
دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۵۳-۵۵ بنی اسرائیل)	داؤد کو زبور دی ہے۔

اس ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے کہ داعی حق کو ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عصبیت جاہلیت کو بھڑکانے والی اور مخاطب کو عناد و اختلاف کی راہ پر ڈال دینے والی ہوں۔

۴- جو لوگ عزت و پیشوائی کے مقام پر سرفراز رہنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اپنے لیے خطاب و کلام میں تعظیم و تکریم کے خوگر ہو چکے ہوں اور اندیشہ ہو کر اس کی خلاف ورزی سے ان کے پندار نفس کا شیطان جاگ اٹھے گا اور ان کو حق بات سننے سے روک دے گا، داعی حق کو چاہیے کہ ایک خاص حد تک ان کی اس بیماری کا لحاظ رکھے تاکہ قبول حق میں ان کے اپنے نفس کی مزاحمتوں کے سوا داعی کی طرف سے کوئی جدید مانع نہ پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی پہلو سے ہدایت کی گئی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ	فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے

قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۴۴- طٰہٰ) نرمی سے بات کرو تاکہ وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

لیکن یہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جہاں تک اس حق کے احترام و وقار کے خلاف نہ ہو جس کو داعی پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ لحاظ کسی پہلو سے حق کے وقار کو صدمہ پہنچائے تو پھر یہ چیز جائز نہیں ہے۔ قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔

۴۔ جس طرح ایک ماہر طبیب مریض کی عمر، اس کے مزاج اور مرض کی شدت و خفت کے لحاظ سے اس کے لیے دوا کی خوراک تجویز کرتا ہے اسی طرح ایک داعی حق کا بھی فرض ہے کہ وہ مخاطب کی استعداد طلب اور ظرف کے لحاظ سے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ اس چیز کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے صرف مخاطب کی نوعی استعداد اور قابلیتوں ہی کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس کی قومی خصوصیات اور اس کے انفرادی حالات کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کا لحاظ کیے بغیر کسی دعوت کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے قرآن مجید مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ وقرآنا فرقناه لتقرأه علی الناس علیٰ مکث ونزلناه تنزیلا (اور ہم نے قرآن کو مختلف وقتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا تاکہ تو لوگوں کے سامنے ٹھیر ٹھیر کے پیش کرے اور ہم نے اس کو اہتمام کے ساتھ اتارا)۔ اسی طرح قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی دعوت میں بہت سی باتیں عربوں کے افتاد مزاج کے لحاظ سے اختیار کی گئیں۔ مثلاً چونکہ وہ ضدی اور جھگڑالو (قوماً لدا) تھے اس وجہ سے ان سے بحث و مناظرہ کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو ایک جھگڑالو اور ضدی قوم کے لیے موزوں تھا۔ نیز آنحضرت صلعم دیہات سے آنے والے لوگوں کے سامنے دین کو جس انداز سے پیش کرتے تھے وہ اس سے بالکل مختلف تھا جس انداز سے آپ مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو دعوت دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ طریق دعوت کا یہ فرق محض ان جماعتوں کی نفسیات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ جن کا اختلاف معمولی اور جن کی الجھنیں سادہ تھیں ان کے سامنے دین کی سیدھی سادی تعلیمات پیش کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ ان پر عمل کریں۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری الجھنیں رکھتے تھے ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ

لگاتار دعوت دی جاتی تھی ۔

۵۔ جس طرح ایک دہقان کے لیے زمین کی تیاری اور موسم کی سازگاری کے بغیر بیج ڈالنا جائز نہیں ہے اور ایک طبیب مرض کے بحران کی حالت میں مریض کو دوا دینے سے احتراز کرتا ہے اسی طرح ایک داعی حق کو ان تمام اوقات میں دعوت سے احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی پر مستعد ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس حالت میں دعوت پیش کرنے سے احتراز ضروری ہے بلکہ اگر دعوت کو پیش کرنے کے بعد بھی مخاطب پر اعتراض و نکتہ چینی کا دورہ پڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ بحث کو بڑھانے کے بجائے اس کو وہیں ختم کر کے وہاں سے علیحدہ ہو جائے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرے جب مخاطب خالی الذہن یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے شوق سے محفوظ ہو۔

اذا رأیت الذین یخوضون فی ایٰتنا فاعرض عنہم حتٰی یخوضوا فی حدیث غیرہٖ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکرٰی مع القوم الظٰلمین (انعام ۶۸)

جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان سے اعراض کرو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمھیں یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو

اس صریح ہدایت کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے تبلیغ دین کے لیے مناظرے کے طریقہ کو کیسے جائز سمجھا جس میں دونوں فریق اکٹھے ہی اس مقصد سے ہوتے ہیں کہ اپنے حریف کی بات کی تردید و تکذیب کریں گے اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو مناظرہ کی مجالس کا کچھ تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان مجالس سے صرف اس "خوض" کے شوق کو شہ ملتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اس کی بو محسوس کرتے ہی داعی حق کو مجلس سے دامن جھاڑ کے اٹھ جانا چاہیے۔ لیکن ہمارے مناظرین کو یہ بو اس قدر مرغوب رہی ہے کہ جس قدر یہ بڑھی اسی قدر ان کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا۔

۶۔ اسی طرح ان مواقع سے بھی داعی کو احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دلچسپی میں منہمک ہو

کہ دعوت حق کی طرف متوجہ ہونا اس کی طبیعت پر گراں گذرے۔ اگرچہ یہ حالت پہلی حالت سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عناد و اختلاف کا جذبہ شامل نہیں ہے لیکن مخاطب کی طبیعت کی عدم مستعدی کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن عکرمۃ ان ابن عباس قال حدث الناس کل جمعۃ مرۃ فان ابیت فمرتین فان اکثرت فثلاث ولا تمل الناس ھذا القرآن ولا الفینک تاتی القوم وھم فی حدیث من حدیثھم فتقص علیھم فتقطع علیھم حدیثھم فتملھم ولکن انصت فاذا امروک فحدثھم وھم یشتھونہ

عکرمہ سے روایت ہے کہ ابن عباس نے کہا کہ لوگوں کو جمعہ جمعہ وعظ کیا کرو۔ اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دوبار۔ اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین بار۔ اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کر دو اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم لوگوں کے پاس ایسے وقت میں آؤ جب وہ اپنی کسی اور دلچسپی میں ہوں اور اس وقت ان کو وعظ سنانا شروع کر دو اور نتیجہ اس کا بیزاری ہو۔ ایسے مواقع پر خاموش رہو۔ یہاں تک کہ لوگ تم سے خواہش کریں تو ان کو سناؤ تاکہ تمہارا وعظ وہ رغبت سے سنیں۔

۷۔ داعی حق کے لیے اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی خشکی و یکرنگی، اس کی بے ضرورت تکرار اور اس کے بے فائدہ طول بیان سے سننے والے اس سے بدحظ اور بیزار نہ ہونے پائیں۔

عن شقیق قال کان عبد اللہ بن مسعود یذکر الناس فی کل خمیس فقال لہ رجل یا ابا عبد الرحمٰن لوددت انک ذکرتنا فی کل یوم قال اما انہ یمنعنی من ذلک انی اکرہ ان املکم وانی اتخولکم بالموعظۃ کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شقیق سے روایت ہے کہ عبد الرحمٰن بن مسعود ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن (عبد اللہ بن مسعود کی کنیت ہے) میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرمایا کریں۔ حضرت نے جواب دیا کہ میں دیا صرف اس خیال سے نہیں کرتا کہ کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ میں بھی اسی طرح ناغہ کرکے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جس طرح

يتخولنا بها مخافة السامة علينا (متفق علیہ) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ناغہ کر کے نصیحت کیا کرتے تھے تاکہ ہم بیزار نہ ہونے پائیں۔

یہ سطریں لکھتے وقت ہمارے سامنے ان واعظین اور ان کے بدقسمت اور مظلوم سامعین کی ایک تصویر آگئی ہے جن کی وعظ گوئی کا سب سے بڑا ہنر ان کا لایعنی طول کلام ہے اور جو اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ بہتر سے بہتر بات بھی بے ضرورت بار بار دھرانے سے ناگوار بن جایا کرتی ہے اور وعظ سنانے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑ جانے سے نہ صرف یہ کہ دعوت دین کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ الٹے اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے۔ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ لوگوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ نصیحت فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ بدحظ نہ ہونے پائیں۔ آپ کے خطبے نہایت مختصر ہوا کرتے تھے۔ اور روایات میں آتا ہے کہ آپ کی ہدایت تھی کہ "جب نصیحت کرو تو مختصر نصیحت کرو"۔ اور بعض روایات میں خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانشمندی کی علامت قرار دیتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض خطبے جادو ہوتے ہیں"۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خطبے مختصر اور جامع و بلیغ ہونے چاہییں کہ جادو کی طرح دلوں پر اثر کریں نہ کہ سننے والے کی طبیعت کو کند کر دیں کہ اس میں کسی بات کو سننے اور اس کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہ جائے۔

۸- ایک داعی حق کو اپنے گرد و پیش کا پوری ہوشیاری و مستعدی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے کب کوئی موزوں موقع ہاتھ آتا ہے اور جوں ہی وہ محسوس کرے کہ اس مقصد کے لیے کوئی موقع پیدا ہو گیا ہے بغیر کسی توقف کے اسے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ملتی ہے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۚ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ

اور اس کے ساتھ دو نوجوان قید خانہ میں داخل ہوئے ایک نے کہا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں

کھا رہی ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ آپ نہایت بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یوسف نے کہا جو کھانا تمھیں ملتا ہے اس کے ملنے سے پہلے میں اس کی تعبیر تمھیں بتا دوں گا۔ یہ ان باتوں میں سے ہے جن کی تعلیم مجھے میرے رب نے دی ہے۔ میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی تھی اور وہ آخرت کی بھی منکر تھی، اور میں نے پیروی کی اپنے باپ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی ملت کی۔ ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھیرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر فضل ہے لیکن اکثر لوگ اس کی شکرگزاری نہیں کرتے۔ اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! کیا بہت سے رب بنانا بہتر ہے یا ایک اللہ واحد قہار کو؟ اس کے سوا نہیں تم پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، جن کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو فیصلہ کا اختیار نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا۔ باقی رہا دوسرا تو اس کو سولی ہوگی اور چڑیاں اس کے سر کو نوچیں گی۔ تو اس بات کا فیصلہ ہو گیا جس کو تم دریافت کر رہے تھے۔

مِنَ الْمُحْسِنِينَ قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ ۚ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ (۳۶ - ۴۱ یوسف)

اس پر ایک نظر ڈال کر واقعہ کی پوری تصویر چشم تصور کے سامنے لائیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو آدمی جیل میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں خواب دیکھتے ہیں۔ انھیں خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا شوق

ہوتا ہے۔ قید خانہ کے آدمیوں میں ہر اعتبار سے صرف حضرت یوسف علیہ السلام ایسے آدمی ان کو نظر آئے جن کی طرف اس غرض کے لیے وہ رجوع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حسن عقیدت و احترام کے جذبے کے ساتھ اپنے خواب ان کے سامنے پیش کیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس موقع پر یہ نہیں کرتے کہ انھیں خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دیں یا ان کے جذبۂ عقیدت سے فائدہ اٹھا کر ان پر اپنی شخصیت و بزرگی کا رعب جمانے کی کوشش کریں اور اس سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہیں بلکہ وہ ان کے اس التفات کو غنیمت سمجھ کر وہ دعوت ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو ان کے دل سے لگی ہوتی ہے۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

اور پیش کرنے کا انداز ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ سخن میں بات میں بات پیدا ہو گئی ہے نہ کہ قصداً کر کے ایک بات کہنے کے لیے موقع پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے ایک اہم حقیقت تو یہ سامنے آئی کہ جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے لیے گھات لگائے بارش کا انتظار کرتا ہے اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنی چاہیے کہ کب کسی دل میں اس کے لیے وہ التفات پیدا ہوتا ہے جو اس کی دعوت کی تخم ریزی کے لیے فصل و موسم کا کام دے سکتا ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کوئی اس طرح کا موقع میسر آ جائے تو نہ تو اس کو ضائع کرنا جائز ہے اور نہ اس اعلیٰ مقصد کے سوا کسی اور غرض کے لیے اس کو استعمال کرنا جائز ہے۔ اس طرح کے مواقع جب خود غرض لوگوں کو ملتے ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان کو دعوت حق کے لیے استعمال کریں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ اس زمانہ میں عام طور پر ہمارے علماء و مشائخ اسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ وہ جب اپنی طرف کسی دل کو ملتفت پاتے ہیں تو اس کو دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان کی خوشی اس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح کی خوشی حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھیوں کے التفات سے ہوئی تھی بلکہ یہ خوشی اس مکڑی کی خوشی کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اردگرد جالا تن کر مکھیوں کے انتظار میں بیٹھتی ہے اور جب کسی مکھی کو پاس آتے دیکھتی ہے تو جوش نشاط سے ناچنے لگتی ہے کہ ایک

فریب شکار رہا تھا آیا۔

۹- ہر داعی حق کے لیے بحث و استدلال میں مخاطب کے درجہ اور حیثیت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً اہل علم سے جو خطاب ہوگا اور جس انداز اور جس لب و لہجہ میں ہوگا وہ اس انداز اور لب و لہجہ سے مختلف ہوگا جو عوام کے لیے اختیار کیا جائے گا۔ ایک داعی حق کے لیے محض اس بنیاد پر کہ پوری سچائی صرف اسی کے ساتھ ہے، یہ بات جائز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ دوسری تمام جماعتوں کو جن کے پاس پوری سچائی نہیں ہے، ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دے بلکہ اس کو چاہیے کہ ان کو ٹھیک ٹھیک تول کر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے ان کی جگہوں پر رکھے اور ہر ایک کی حیثیت کا لحاظ کر کے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ مثلاً اہل کتاب کے سامنے دعوت پیش کرنے کے متعلق قرآن مجید نے یہ ہدایت فرمائی ہے:-

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي	اور اہل کتاب سے بحث کرو مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہے
هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا	مگر وہ جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو ہم ایمان لائے
آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ	اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس چیز پر
وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ	جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور ہمارا معبود اور تمہارا
(۴۶- عنکبوت)	معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہاں جس احسن طریقہ سے اہل کتاب سے مباحثہ کرنے کی اجازت دی ہے اس کی صورت بھی بیان کر دی ہے کہ وہ جن پہلوؤں سے تمہارے ہم رتبہ ہیں یا جو امور ان کے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں ان کا اقرار کرو تاکہ ان کے اور تمہارے درمیان نفرت کے بجائے موانست اور دوری کے بجائے قرب پیدا ہو اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کرو کہ ان مسلمات سے جو باتیں لازم آتی ہیں اس میں بھی وہ تمہارے ساتھ متفق ہو جائیں۔ اس طریق دعوت کا نفسیاتی اثر مخاطب پر یہ ہوگا کہ وہ یہ خیال کرے گا کہ داعی نہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہے اور نہ اپنی دعوت کو کسی نئے انکشاف کی حیثیت سے

پیش کر رہا ہے بلکہ اس دعوت میں جتنا حصہ مخاطب کا ہے اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر رہا ہے، وہ اس پر غور کرنے کی طرف مائل ہوگا اور اگر کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم نہ ہوگا تو اس کو قبول بھی کرے گا۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے بلکہ اہل علم اور اہل کتاب کو بھی اسی طرح خطاب کیا جائے جس طرح امیوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کا پندار مجروح ہوگا جو داعی ہی کی طرح علم اور کتاب کے مدعی ہیں اور یہ چیز قبولِ دعوت کی راہ میں شدید مزاحمت پیدا کرے گی۔

۱۰۔ داعی حق اگر مخاطب کے اندر عناد اور ہٹ دھرمی کی بو محسوس کرے تو اپنی طرف سے ہرگز اس بات کا موقع نہ دے کہ اس کا یہ ذوق ابھرے بلکہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے یہاں تک کہ اگر وہ داعی کی کسی دلیل پر ایسا معارضہ کر بیٹھے جو بالکل کھلی ہوئی دھاندلی ہو جب بھی اس دلیل کے پیچھے پڑنے اور اس پر رد و کد کے بجائے اس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے سامنے امرِ حق کسی ایسے پہلو سے پیش کیا جائے جس پر اس کو اپنی ہٹ دھرمی کے اظہار کا موقع نہ ملے بلکہ اگر اس میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو تو اس کو قبول کرے اور اگر نرا معاند ہی ہو تو کم از کم ہکا بکا ہو کے رہ جائے اس کو بحث و جدال کا کوئی موقع نہ ملے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ قرآن مجید میں مذکور ہے جو اس کی بہترین مثال ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَاۤجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۲۵۸ ۔ بقرہ)

کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس وجہ سے جھگڑا کیا کہ اللہ نے اس کو اقتدار بخشا جبکہ ابراہیم نے اس سے کہا میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اس نے کہا میں مارتا ہوں اور میں زندہ کرتا ہوں، ابراہیم نے کہا اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اس کو پچھم سے نکال تو کافر ہکا بکا ہو کے رہ گیا، اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی تھی وہ معترض کے معارضہ سے ذرا بھی مجروح نہیں ہوئی تھی اور وہ چاہتے تو اس پر بہت کچھ فرما سکتے تھے لیکن مخاطب کی نفسیات کا اندازہ کر لینے کے بعد اگر وہ اس پر مزید اصرار فرماتے تو یہ چیز اس طریقہ کے بالکل خلاف ہوتی جس کی تلقین قرآن نے فرمائی ہے کہ ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

انگریزی زبان میں ایک مذہبی رسالہ کا اجراء

مشہور شہرین نو مسلم محمد اسد صاحب جو زمانہ جنگ میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اب الحمد للہ قید فرنگ سے آزاد ہو کر پھر اپنے علمی و مذہبی کاموں میں مشغول ہو رہے ہیں۔ موصوف گرفتاری سے پہلے صحیح بخاری کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے تھے جس کے کچھ پارے چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی ایک کتاب Islam at the Crossroads علمی و مذہبی حلقوں میں کافی شہرت پا چکی ہے۔ جو لوگ ان کتابوں سے واقف ہیں وہ موصوف کے طرز فکر اور انداز بحث سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اب ہمیں یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی ہے کہ موصوف ماہ اگست ۱۹۴۶ء سے ڈلہوزی سے، انگریزی زبان میں عرفات نامی ایک پرچہ نکال رہے ہیں جس کا اشتہار ان صفحات میں کہیں دیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ان توقعات کے بالکل مطابق ہوگا جو مصنف سے علمی و مذہبی حلقوں میں قائم ہو چکی ہیں۔

تفہیم القرآن

(۳۸)

ہود

(از رکوع ۶ تا ختم سورہ)

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔[۱] اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارے لیے کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے[۲] اور یہاں تم کو بسایا ہے۔[۳] لہٰذا تم اس سے معافی چاہو[۴] اور اس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔"[۵]

---

[۱] سورہ اعراف رکوع ۱۰ کے حواشی پیش نظر رہیں۔

[۲] یہ دلیل ہے اس دعوے کی جو پہلے فقرے میں کیا گیا تھا کہ اللہ کے سوا تمہارے لیے کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ مشرکین خود بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ان کا خالق اللہ ہی ہے۔ اسی مسلمہ حقیقت پر بنائے استدلال قائم کر کے حضرت صالح ان کو سمجھاتے ہیں کہ جب وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کے بے جان مادوں کی ترکیب سے تم کو یہ انسانی وجود بخشا، اور وہ بھی اللہ ہی ہے جس نے زمین میں تم کو آباد کیا، تو پھر اللہ کے سوا دوسرا کس کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی و پرستش کرو۔

[۳] یعنی اب تک جو تم دوسروں کی بندگی و پرستش کرتے رہے ہو اس جرم کی اپنے رب سے معافی مانگو۔

[۴] یہ مشرکین کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا رد ہے جو بالعموم ان سب میں پائی جاتی ہے اور اُن اہم اسباب میں سے ایک ہے جنھوں نے ہر زمانہ میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ کو اپنے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں جو رعیت سے دور اپنے محلوں میں داد عیش دیا کرتے ہیں، جن کے دربار تک عام رعایا میں سے

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

انھوں نے کہا "اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۹) کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانی ہو تو مقربین بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور پھر اگر خوش قسمتی سے کسی کی درخواست ان کے آستانۂ بلند پر پہنچ بھی جاتی ہے تو ان کا پندار خدائی یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس کو جواب دیں، بلکہ جواب دینے کا کام مقربین ہی میں سے کسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس غلط گمان کی وجہ سے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ہوشیار لوگوں نے ان کو ایسا سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ خداوند عالم کا آستانۂ قدس عام انسانوں کی دست رس سے بہت ہی دور ہے، اس کے دربار تک بھلا کسی عامی کی پہنچ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں تک دعاؤں کا پہنچنا اور پھر ان کا جواب ملنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ پاک روحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے اور ان مذہبی منصب داروں کی خدمات نہ حاصل کی جائیں جو اوپر تک نذریں، نیازیں اور عرضیاں پہنچانے کے ڈھب جانتے ہیں۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے بندے اور خدا کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبودوں اور سفارشیوں کا ایک جم غفیر کھڑا کر دیا اور اس کے ساتھ مہنت گری (Priesthood) کا وہ نظام پیدا کیا جس کے توسط کے بغیر جاہلی مذاہب کے پیرو پیدائش سے لے کر موت تک اپنی کوئی مذہبی رسم بھی انجام نہیں دے سکتے۔

حضرت صالح علیہ السلام جاہلیت کے اس پورے طلسم کو صرف دو لفظوں سے توڑ پھینکتے ہیں ایک یہ کہ اللہ قریب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مجیب ہے۔ یعنی تمھارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ تم سے دور ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ تم براہ راست اس کو پکار کر اپنی دعاؤں کا جواب حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اگرچہ بہت بالا و برتر ہے مگر اس کے باوجود وہ تم سے بہت قریب ہے۔ تم میں سے ایک ایک شخص اپنے پاس ہی اس کو پا سکتا ہے۔ اس سے سرگوشی کر سکتا ہے، خلوت اور جلوت دونوں میں علانیہ بھی اور بصیغۂ راز بھی اپنی عرضیاں اس کے حضور میں پیش کر سکتا ہے۔ اور وہ براہ راست اپنے ہر بندے کی دعاؤں کا جواب خود دیتا ہے۔ پس جب سلطان کائنات کا دربار عام ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا ہے اور ہر شخص کے قریب ہی موجود ہے تو یہ تم کس حماقت میں پڑے ہو کر اس کے لیے واسطے اور وسیلے ڈھونڈتے پھرتے ہو۔

وابستہ تھیں[۱]۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے[۲]؟ تو جس طریقہ کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے[۳]۔"

[۱] یعنی تمھاری ہوشمندی، ذکاوت، فراست، سنجیدگی و متانت اور پروقار شخصیت کو دیکھ کر ہم یہ امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ بڑے آدمی بنو گے، اپنی دنیا بھی خوب بناؤ گے اور ہمیں بھی دوسری قوموں اور قبیلوں کے مقابلے میں تمھارے تدبر سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ مگر تم نے یہ توحید اور آخرت کا نیا راگ چھیڑ کر تو ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یاد رہے کہ ایسے ہی کچھ خیالات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی آپ کے ہم قوموں میں پائے جاتے تھے۔ وہ بھی نبوت سے پہلے آپ کی بہترین قابلیتوں کے معترف تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص ایک بہت بڑا تاجر بنے گا اور اس کی بیدار مغزی سے ہم کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ مگر جب ان کی توقعات کے خلاف آپ نے توحید و آخرت اور مکارم اخلاق کی دعوت دینی شروع کی تو وہ آپ سے نہ صرف مایوس بلکہ بیزار ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا خاصہ کام کا آدمی تھا، خدا جانے اسے کیا جنون لاحق ہو گیا کہ اپنی زندگی بھی برباد کی اور ہماری امیدوں کو بھی خاک میں ملا دیا۔

[۲] یہ گویا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ معبود کیوں عبادت کے مستحق ہیں اور ان کی پوجا کس لیے ہوتی رہنی چاہیے۔ یہاں جاہلیت اور اسلام کے طرز استدلال کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت صالح نے کہا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، اور اس پر دلیل یہ دی تھی کہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور زمین میں آباد کیا ہے۔ اس کے جواب میں ان کی مشرک قوم کہتی ہے کہ ہمارے یہ معبود بھی مستحق عبادت ہیں اور ان کی عبادت ترک نہیں کی جا سکتی کیونکہ باپ دادا کے وقتوں سے ان کی عبادت ہوتی چلی آرہی ہے۔ یعنی مکھی پر مکھی صرف اس لیے ماری جاتی رہنی چاہیے کہ ابتدا میں کسی بیوقوف نے اس جگہ مکھی مار دی تھی، اور اب اس مقام پر مکھی مارتے رہنے کے لیے اس کے سوا کسی معقول وجہ کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں مدتوں سے مکھی ماری جا رہی ہے۔

[۳] یہ شبہہ اور یہ خلجان کس امر میں تھا، اس کی کوئی تصریح یہاں نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلجان میں تو سب پڑ گئے تھے، مگر ہر ایک کا خلجان الگ نوعیت کا تھا۔ یہ دعوت حق کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب اٹھتی

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

صالح نے کہا "اے برادرانِ قوم! تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو۔[۵] اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے، اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آجائے گا۔"

مگر انھوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالح نے ان کو خبردار کر دیا کہ "بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی۔"

آخر کار جب ہمارے فیصلہ کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔ بے شک تیرا رب ہی دراصل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۱) تو لوگوں کا اطمینانِ قلب رخصت ہو جاتا ہے اور ایک عام بے کلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے احساسات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مگر اس بے کلی میں سب کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مل کر رہتا ہے۔ اس سے پہلے جس اطمینان کے ساتھ لوگ اپنی ضلالتوں میں منہمک رہتے تھے اور کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، وہ اطمینان اس دعوت کے اٹھنے کے بعد باقی نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا۔ نظامِ جاہلیت کی کمزوریوں پر داعیِ حق کی بے رحم تنقید، اثباتِ حق کے لیے اس کے پرزور اور دل لگتے دلائل، پھر اس کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا حلم، اس کی شرافتِ نفس، اس کا نہایت کھرا اور راستبازانہ رویہ اور اس کی وہ زبردست حکیمانہ شان جس کا سکہ بڑے سے بڑے ہٹ دھرم مخالف کے دل پر بھی بیٹھ جاتا ہے، پھر وقت کی سوسائٹی میں سے بہترین عناصر کا اس سے متاثر ہوتے چلے جانا اور ان کی زندگیوں میں دعوتِ حق کی تاثیر سے غیر معمولی انقلاب رونما ہونا، یہ ساری چیزیں مل جل کر ان سب لوگوں کے دلوں کو بے چین کر ڈالتی ہیں جو حق آجانے کے بعد بھی پرانی جاہلیت کا بول بالا رکھنا چاہتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] یعنی اگر میں اپنی بصیرت کے خلاف، اور اس علم کے خلاف جو اللہ نے مجھے دیا ہے، محض تم کو خوش کرنے کے لیے گمراہی کا طریقہ اختیار کر لوں تو یہی نہیں کہ خدا کی پکڑ سے تم مجھے بچا نہ سکو گے، بلکہ تمہاری وجہ سے میرا جرم اور زیادہ بڑھ جائے گا، اور اللہ تعالیٰ مجھے اس بات کی مزید سزا دے گا کہ میں نے تم کو سیدھا راستہ بتانے کے بجائے تمھیں جان بوجھ کر الٹا اور گمراہ کیا۔

طاقتور اور بالادست ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

سنو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیے گئے ثمود؟ ع۶

اور دیکھو، ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوشخبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گذری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔[۱] مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔[۲] انھوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔[۳] ابراہیم کی

۱؎ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے حضرت ابراہیم کے ہاں انسانی صورت میں پہنچے تھے اور ابتداءً انھوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ اس لیے حضرت ابراہیم نے خیال کیا کہ یہ کوئی اجنبی مہمان ہیں اور ان کے آتے ہی فوراً ان کی ضیافت کا انتظام فرمایا۔

۲؎ بعض مفسرین کے نزدیک یہ خوف اس بنا پر تھا کہ جب ان اجنبی نوواردوں نے کھانے میں تامل کیا تو حضرت ابراہیم کو ان کی نیت پر شبہہ ہونے لگا اور آپ اس خیال سے اندیشہ ناک ہوئے کہ کہیں یہ کسی دشمنی کے ارادے سے تو نہیں آئے ہیں، کیونکہ عرب میں جب کوئی شخص کسی کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کرتا تو اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ قتل و غارت کی نیت سے آیا ہے۔ لیکن بعد کی آیت اس تفسیر کی تائید نہیں کرتی۔

۳؎ اس انداز کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہمانوں کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے سے ہی حضرت ابراہیم تاڑ گئے تھے کہ یہ فرشتے ہیں، اور چونکہ فرشتوں کا علانیہ انسانی شکل میں آنا غیر معمولی حالات ہی میں ہوا کرتا ہے اس لیے حضرت ابراہیم کو خوف جس بات پر ہوا وہ دراصل یہ تھی کہ کہیں آپ کے گھر والوں سے یا آپ کی بستی کے لوگوں سے یا خود آپ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے جس پر گرفت کے لیے فرشتے اس صورت میں بھیجے گئے ہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو بعض مفسرین نے سمجھی ہے تو فرشتے یوں کہتے کہ "ڈرو نہیں ہم تمھارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں"۔ لیکن جب انھوں نے آپ کا خوف دور کرنے کے لیے یہ کہا کہ "ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں" تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کا فرشتہ ہونا تو حضرت ابراہیم جان گئے تھے۔ البتہ پریشانی اس بات کی تھی کہ یہ حضرات اس فتنے اور آزمائش کی شکل میں جو تشریف لائے ہیں تو آخر وہ بدنصیب کون ہے جس کی شامت آنے والی ہے۔

بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی، وہ یہ سن کر ہنس دی۔[ۛ۵] پھر ہم نے اُس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی۔[۲] وہ بولی ہائے میری کم بختی[۳]! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جبکہ میں بڑھیا پھونس ہوگئی اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے[۴]؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" فرشتوں نے کہا "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟[۵] ابراہیم کے گھر والو! تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں، اور یقیناً اللہ نہایت قابلِ تعریف اور بڑی شان والا ہے۔"

پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہوگیا تو اس نے قوم

---

[۱] اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آنے کی خبر سنتے ہی سارا گھر پریشان ہوگیا تھا اور حضرت ابراہیم کی اہلیہ بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔ پھر جب انھوں نے یہ سن لیا کہ ان کے گھر پر یا ان کی بستی پر کوئی آفت آنے والی نہیں ہے تب کہیں ان کی جان میں جان آئی اور وہ خوش ہوگئیں۔

[۲] فرشتوں نے حضرت ابراہیم کے بجائے حضرت سارہ کو یہ خوشخبری اس لیے سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم کے ہاں تو ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ سے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے، مگر حضرت سارہ اس وقت تک بے اولاد تھیں اور اس بنا پر دل انہی کا زیادہ غمگین تھا۔ ان کے اس غم کو دور کرنے کے لیے فرشتوں نے انھیں صرف یہی خوشخبری نہیں سنائی کہ تمھارے ہاں اسحاق جیسا جلیل القدر بیٹا پیدا ہوگا بلکہ یہ بھی بتایا کہ اس بیٹے کے بعد پوتا بھی یعقوب جیسا عالی شان پیغمبر ہوگا۔

[۳] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت سارہ فی الواقع اس پر خوش ہونے کے بجائے الٹی اس کو کم بختی سمجھتی تھیں، بلکہ دراصل یہ اُس قسم کے الفاظ میں سے ہے جو عورتیں بالعموم تعجب کے مواقع پر بولا کرتی ہیں اور جن سے لغوی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ محض اظہارِ تعجب مقصود ہوتا ہے۔

[۴] توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی عمر اس وقت ۱۰۰ برس اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ برس کی تھی۔

[۵] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عادۃً اس عمر میں انسان کے ہاں اولاد نہیں ہوا کرتی، لیکن اللہ کی قدرت سے ایسا ہونا کچھ بھی بعید نہیں ہے، اور جب کہ یہ خوشخبری تم کو اللہ کی طرف سے دی جا رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم جیسی ایک مومنہ اس پر تعجب کرے۔

لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔[1] حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ (آخر کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) "اے ابراہیم، اس سے باز آجاؤ، تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے نہیں پھر سکتا"۔[2]

۱؎ "جھگڑے" کا لفظ اس موقع پر اُس انتہائی محبت اور ناز کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیم اپنے خدا کے ساتھ رکھتے تھے۔ اس لفظ سے یہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان بڑی دیر تک رد و کد جاری رہتی ہے۔ بندہ اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط پر سے عذاب ٹال دیا جائے۔ خدا جواب میں کہہ رہا ہے کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اس کے جرائم اس حد سے گزر چکے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جا سکے۔ مگر بندہ ہے کہ پھر بھی کہے جاتا ہے کہ پروردگار! اگر کچھ تھوڑی سی بھلائی بھی اس میں باقی ہو تو اسے اور ذرا مہلت دیدے، شاید کہ وہ بھلائی پھل لے آئے۔ توراة میں اس جھگڑے کی کچھ تشریح بھی بیان ہوئی ہے، لیکن قرآن کا مجمل بیان اپنے اندر اس سے زیادہ معنوی وسعت رکھتا ہے۔

۲؎ اس سلسلۂ بیان میں حضرت ابراہیم کا یہ واقعہ، خصوصاً قوم لوط کے قصے کی تمہید کے طور پر، بظاہر کچھ بے جوڑ سا محسوس ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ اُس مقصد کے لحاظ سے نہایت برمحل ہے جس کے لیے پچھلی تاریخ کے یہ واقعات یہاں بیان کیے جا رہے ہیں۔ اس کی مناسبت سمجھنے کے لیے حسب ذیل دو باتوں کو پیش نظر رکھیے:

(۱) مخاطب قریش کے لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کی وجہ ہی سے تمام عرب کے پیرزادے، کعبۃ اللہ کے مجاور اور مذہبی و اخلاقی اور سیاسی و تمدنی پیشوائی کے مالک بنے ہوئے ہیں، اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ ہم پر خدا کا غضب کیسے نازل ہو سکتا ہے جبکہ ہم خدا کے اُس پیارے بندے کی اولاد ہیں اور وہ خدا کے دربار میں ہماری سفارش کرنے کو موجود ہے۔ اس پندار غلط کو توڑنے کے لیے پہلے تو انہیں یہ منظر دکھایا گیا کہ حضرت نوح جیسا عظیم الشان پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشے کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے اور تڑپ کر خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس کے بیٹے کو بچا لیا جائے مگر صرف یہی نہیں کہ اس کی سفارش بیٹے کے کچھ کام نہیں آتی، بلکہ اس سفارش پر باپ کو الٹی ڈانٹ سننی پڑتی ہے۔ اس کے بعد اب یہ دوسرا منظر خود حضرت ابراہیم کا دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ان پر بے پایاں عنایات ہیں اور نہایت پیار کے انداز میں ان کا ذکر ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف جب وہی ابراہیم خلیل انصاف کے معاملہ میں دخل

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ (ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے، پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لوط نے ان سے کہا "بھائیو!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) دیتے ہیں تو ان کے اصرار و الحاح کے باوجود اللہ تعالیٰ مجرم قوم کے معاملے میں ان کی سفارش کو رد کر دیتا ہے۔

(۲) اس تقریر میں یہ بات بھی قریش کے ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ قانون مکافات جس سے یہ لوگ بالکل بے خوف اور مطمئن بیٹھے ہوئے تھے، کس طرح تاریخ کے دوران میں تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا ہے اور خود ان کے گرد و پیش اس کے کیسے کھلے کھلے آثار موجود ہیں۔ ایک طرف حضرت ابراہیم ہیں جو حق و صداقت کی خاطر گھر سے بے گھر ہو کر ایک اجنبی ملک میں مقیم ہیں اور بظاہر کوئی طاقت ان کے پاس نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے حسن عمل کا یہ پھل ان کو دیتا ہے کہ بانجھ بیوی کے پیٹ سے بوڑھاپے میں اسحاق علیہ السلام پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کے ہاں یعقوب علیہ السلام کی پیدائش ہوتی ہے اور ان سے بنی اسرائیل کی وہ عظیم الشان نسل چلتی ہے جس کی عظمت کے ڈنکے صدیوں تک اسی فلسطین و شام میں بجتے رہے جہاں حضرت ابراہیم ایک بے خانماں مہاجر کی حیثیت سے آکر آباد ہوئے تھے۔ دوسری طرف قوم لوط ہے جو اسی سرزمین کے ایک حصہ میں اپنی خوشحالی پر مگن اور اپنی بدکاریوں میں مست ہے، دور دور تک کہیں بھی اس کو اپنی شامت اعمال کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں اور لوط علیہ السلام کی نصیحتوں کو وہ چٹکیوں میں اڑا رہی ہے۔ مگر جس تاریخ کو ابراہیم کی نسل سے ایک بڑی اقبالمند قوم کے اٹھائے جانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ٹھیک وہی تاریخ ہے جب اس بدکار قوم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کا فرمان نافذ ہوتا ہے اور وہ ایسے عبرتناک طریقہ سے فنا کی جاتی ہے کہ آج کہیں ڈھونڈے سے بھی اس کی بستیوں کا نشان نہیں ملتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ سورہ اعراف رکوع ۱۰ پیش نظر رہے۔

۲؎ اس قصے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان کے فحوائے کلام سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوط اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں۔[۵۱] کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے"؟ انھوں نے جواب دیا "تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔[۵۲] اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں"۔ لوط نے کہا "کاش میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمھیں سیدھا کر دیتا، یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا"۔ تب فرشتوں نے اس سے کہا کہ "اے لوط! ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بس تو کچھ رات رہے

[۵۱] ہو سکتا ہے کہ حضرت لوط کا اشارہ قوم کی لڑکیوں کی طرف ہو، کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کا اشارہ خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت لوط نے ان سے زنا کرنے کے لیے کہا ہوگا۔ "یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں" کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوط کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوت نفس کو اُس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لیے عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

[۵۲] یہ فقرہ ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خباثت میں کس قدر ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں رہی تھی کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی خلاف فطرت راہ پر چل پڑے تھے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی، ان کے نفس میں اب طلب اس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ تو ہمارے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروتر کسی مرتبے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس شخص کا معاملہ تو بہت ہلکا ہے جو محض نفس کی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہو مگر حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو بچنے کے قابل چیز سمجھتا ہو۔ ایسا شخص کبھی سدھر بھی سکتا ہے، اور نہ سدھرے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بگڑا ہوا انسان ہے۔ مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام ہی میں ہو اور وہ سمجھے کہ حلال اس کے لیے ہے ہی نہیں تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دراصل ایک گندا کیڑا ہے جو غلاظت ہی میں پرورش پاتا ہے اور طیبات سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے کیڑے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۴ پر)

اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا۔ اور دیکھو، تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے[۱]، مگر تیری بیوی (ساتھ نہیں جائے گی) کیونکہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرنا ہے[۲]۔ ان کی تباہی کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے ــــ صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے!"

پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر
تابڑ توڑ برسائے[۳] جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا[۴]۔ اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے[۵]۔ ع۷

اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) اگر کسی صفائی پسند انسان کے گھر میں پیدا ہو جائیں تو وہ پہلی فرصت میں فنائل ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے۔ پھر بھلا خدا اپنی زمین پر ان گندے کیڑوں کے اجتماع کو کب تک گوارا کر سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ اب تم لوگوں کو بس یہ فکر ہونی چاہیے کہ کسی طرح جلدی سے جلدی اس علاقے سے نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے شور اور دھماکوں کی آوازیں سن کر راستے میں ٹھیر جاؤ اور جو رقبہ عذاب کے لیے نامزد کیا جا چکا ہے اس میں عذاب کا وقت آ جانے کے بعد بھی تم میں سے کوئی رکا رہ جائے۔

[۲] یہ تیسرا عبرتناک واقعہ ہے جو اس سورہ میں لوگوں کو یہ سبق دینے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ تم کو کسی بزرگ کی رشتہ داری اور کسی بزرگ کی سفارش اپنے گناہوں کی پاداش سے نہیں بچا سکتی۔

[۳] غالباً یہ عذاب ایک سخت زلزلے اور آتش فشانی انفجار کی شکل میں آیا تھا۔ زلزلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھراؤ ہوا۔ پکی ہوئی مٹی کے پتھروں سے مراد شاید وہ متحجر مٹی ہے جو آتش فشاں علاقے میں زیر زمین حرارت اور لاوے کے اثر سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

[۴] یعنی ہر ہر پتھر خدا کی طرف سے نامزد کیا ہوا تھا کہ اسے تباہ کاری کا کیا کام کرنا ہے۔

[۵] یعنی آج جو لوگ ظلم کی اس روش پر چل رہے ہیں وہ بھی اس عذاب کو اپنے سے دور نہ سمجھیں۔ یہ عذاب اگر قوم لوط پر آ سکتا تھا تو ان پر بھی آ سکتا ہے۔ خدا کو نہ لوط کی قوم عاجز کر سکتی تھی، نہ یہ کر سکتے ہیں۔

[۶] سورہ اعراف رکوع ۱۱ کے حواشی پیش نظر رہیں۔

اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارے لیے کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور اے برادرانِ قوم! ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔[۹۵] اور بہرحال میں تمھارے اوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں۔[۹۶]"

انھوں نے جواب دیا "اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے[۹۷] کہ ہم ان سارے معبودوں

---

۹۵ سورہ اعراف کے حواشی میں ہم تفصیل بتا چکے ہیں کہ اہل مدین تجارت پیشہ لوگ تھے، اور ان کے اندر کاروباری بددیانتی کا مرض عام ہو گیا تھا۔ نیز ہم یہ بھی پہلے بیان کر آئے ہیں کہ یہ کوئی ایسی قوم نہ تھی جس کو پہلے پہل حضرت شعیبؑ نے دین اسلام سے روشناس کرایا ہو، بلکہ دراصل یہ ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے اسلام ان کا آبائی دین تھا اور ان کو خود اپنے مومن ہونے کا دعویٰ بھی تھا، لیکن ان کے اندر شرک نے راہ پالی تھی اور یہ اسی قسم کی مشرکانہ گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو بالعموم اخلاقی و عملی انحطاط کے دور میں مسلمان قوموں کے اندر پھیل جایا کرتی ہیں۔ یہی وہ خرابیاں تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرت شعیبؑ نے آواز اٹھائی تھی۔

۹۶ یعنی میرا کوئی زور تم پر نہیں ہے۔ میں تو بس ایک خیرخواہ ناصح ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمھیں سمجھا دوں۔ آگے تمھیں اختیار ہے، چاہے مانو، چاہے نہ مانو۔ سوال میری بازپرس سے ڈرنے یا نہ ڈرنے کا نہیں ہے۔ اصل چیز خدا کی بازپرس ہے جس کا اگر تمھیں کچھ خوف ہو تو اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ۔

۹۷ یہ دراصل ایک طعن آمیز فقرہ ہے جس کی روح آج بھی آپ ہر اس سوسائٹی میں موجود پائیں گے جو خدا سے غافل اور فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی ہو۔ چونکہ نماز دینداری کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں مظہر ہے، اور دینداری کو فاسق و فاجر لوگ ایک خطرناک، بلکہ سب سے زیادہ خطرناک مرض سمجھتے ہیں، اس لیے نماز ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں عبادت کے بجائے علامتِ مرض شمار ہوتی ہے اور کسی شخص کو اپنے درمیان نماز پڑھتے دیکھ کر انھیں فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس شخص پر "مرضِ دینداری" کا حملہ ہو گیا ہے۔ پھر یہ لوگ دینداری کی اس خاصیت کو بھی جانتے ہیں کہ یہ چیز جس شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے وہ صرف اپنے حسنِ عمل پر قانع نہیں رہتا بلکہ دوسروں کو بھی

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟[لہ] بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راستباز آدمی رہ گیا ہے!"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) درست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بے دینی و بد اخلاقی پر تنقید کیے بغیر اس سے رہا نہیں جاتا، اس لیے نمازپران کا اضطراب صرف اسی حیثیت سے نہیں ہوتا کہ ان کے ایک بھائی پر دینداری کا دورہ پڑ گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی انھیں یہ کھٹکا بھی لگ جاتا ہے کہ اب عنقریب اخلاق و دیانت کا وعظ شروع ہونے والا ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں کیڑے نکالنے کا ایک لامتناہی سلسلہ چھڑا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی میں نماز سب سے بڑھ کر طعن و تشنیع کی ہدف بنتی ہے۔ اور اگر کہیں نمازی آدمی ٹھیک ٹھیک انہی اندیشوں کے مطابق، جو اس کی نماز سے پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، برائیوں پر تنقید اور بھلائیوں پر دعوت بھی شروع کر دے، تب تو نماز اس طرح کوسی جاتی ہے گویا یہ ساری بلا اسی چیز کی لائی ہوئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ یہ اسلام کے مقابلہ میں جاہلیت کے نظریہ کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے غلط ہے اور اس کی پیروی نہ کرنی چاہیے کیونکہ کسی دوسرے طریقے کے لیے عقل، علم اور کتب آسمانی میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی بندگی صرف ایک محدود مذہبی دائرے ہی میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کا ہے اور انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر خود مختارانہ تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ بھی چلا آ رہا ہو انسان کو اسی کی پیروی کرنی چاہیے اور اس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوجا پاٹ سے ہے، رہے ہماری زندگی کے عام دنیوی معاملات تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔

اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیل آج کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج یورپ اور اس کے شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت کوئی "نئی روشنی" نہیں ہے جو انسان کو

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

شعیب نے کہا "بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے اپنے ہاں سے مجھ کو اچھا رزق بھی عطا کیا[۱] (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔[۲] میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) آج ذہنی ارتقاء کی بدولت نصیب ہو گئی ہو، بلکہ یہ وہی پرانی تاریک خیالی ہے جو ہزارہا برس پہلے کی جاہلیت میں بھی اسی شان سے پائی جاتی تھی۔ اور اس کے خلاف اسلام کی کشمکش بھی آج کی نہیں ہے، بہت قدیم ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] رزق کا لفظ یہاں دوہرے معنی دے رہا ہے۔ اس کے ایک معنی تو علم حق کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشا گیا ہو۔ اور دوسرے معنی وہی ہیں جو بالعموم اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ ذرائع جو زندگی بسر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ آیت اسی مضمون کو ادا کر رہی ہے جو اس سورے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نوح علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا چلا آیا ہے کہ اگر نبوت سے پہلے بھی میں اپنے رب کی طرف سے حق کی کھلی کھلی شہادت اپنے نفس میں اور کائنات کے آثار میں پا رہا تھا، اور اس کے بعد میرے رب نے براہ راست علم حق بھی مجھے دیدیا، تو اب میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ جان بوجھ کر اُن گمراہیوں اور بداخلاقیوں میں تمہارا ساتھ دوں جن میں تم مبتلا ہو۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ آیت اُس طعنے کا جواب ہے جو ان لوگوں نے حضرت شعیب کو دیا تھا کہ "بس تم ہی تو ایک عالی ظرف اور راستباز آدمی رہ گئے ہو"۔ اس تند و ترش حملے کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بھائیو! اگر میرے رب نے مجھے حق شناس بصیرت بھی دی ہو اور رزق حلال بھی عطا کیا ہو تو آخر تمہارے طعنوں سے یہ فضل غیر فضل کیسے ہو جائے گا، اور آخر میرے لیے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے مجھ پر یہ فضل کیا ہے تو میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں کو حق اور حلال کہہ کر اس کی ناشکری کروں۔

[۲] یعنی میری سچائی کا تم اسی بات سے اندازہ کر سکتے ہو کہ جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں اسی پر خود عمل کرتا ہوں اگر میں تم کو غیر اللہ کے آستانوں سے روکتا اور خود کسی آستانے کا مجاور بن بیٹھا ہوتا تو بلاشبہ تم یہ کہہ سکتے تھے کہ اپنی پیری چمکانے کے لیے دوسری دکانوں کی ساکھ بگاڑنا چاہتا ہے۔ اگر میں تم کو حرام کے مال کھانے سے منع کرتا اور خود اپنے کاروبار میں بے ایمانیاں کر رہا ہوتا تو ضرور تم یہ شبہ کر سکتے تھے کہ میں اپنی ساکھ جمانے کے لیے ایمانداری

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے برادرانِ قوم! میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخرکار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوح یا ہود یا صالح کی قوم پر آیا تھا، اور لوط کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔[ا] دیکھو! اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے[۲]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰) کا ڈھول پیٹ رہا ہوں۔ لیکن تم دیکھتے ہو کہ میں خود ان برائیوں سے بچتا ہوں جن سے تم کو منع کرتا ہوں، میری اپنی زندگی ان دھبوں سے پاک ہے جن سے تمہیں پاک دیکھنا چاہتا ہوں اور میں نے اپنے لیے بھی اسی طریقہ کو پسند کیا ہے جس کی تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔ یہ چیز اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ میں اپنی اس دعوت میں صادق ہوں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [ا] یعنی قوم لوط کا واقعہ تو ابھی تازہ ہی ہے اور تمہارے قریب ہی کے علاقے میں پیش آچکا ہے۔ غالباً اس وقت قوم لوط کی تباہی پر تین چار سو برس سے زیادہ نہ گزرے تھے۔ اور ویسے بھی قوم شعیب کا ملک اُس علاقے سے بالکل متصل واقع تھا جہاں قوم لوط رہتی تھی۔

[۲] یعنی اللہ تعالیٰ سنگ دل اور بے رحم نہیں ہے اور نہ اس کو اپنی مخلوقات سے کوئی دشمنی ہے کہ خواہ مخواہ سزا دینے ہی کو اس کا جی چاہے اور اپنے بندوں کو مار مار کر وہ خوش ہو۔ تم لوگ اپنی سرکشیوں میں جب حد سے گزر جاتے ہو اور کسی طرح فساد پھیلانے سے باز ہی نہیں آتے تب وہ بادلِ ناخواستہ تمہیں سزا دیتا ہے۔ ورنہ اس کا حال تو یہ ہے کہ تم خواہ کتنے ہی قصور کر چکے ہو، جب بھی اپنے افعال پر نادم ہو کر اس کی طرف پلٹو گے اس کے دامن رحمت کو اپنے لیے وسیع پاؤ گے کیونکہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے وہ بے پایاں محبت رکھتا ہے۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نہایت لطیف مثالوں سے واضح فرمایا ہے۔ ایک مثال تو آپ نے یہ دی ہے کہ اگر تم میں سے کسی شخص کا اونٹ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں کھو گیا ہو اور اس کے کھانے پینے کا سامان بھی اسی اونٹ پر ہو اور وہ شخص اس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکا ہو یہاں تک کہ زندگی سے بے آس ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا ہو، اور عین اس حالت میں یکایک وہ دیکھے کہ اس کا اونٹ سامنے کھڑا ہے، تو اس وقت

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

انھوں نے جواب دیا "اے شعیبؑ! تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں[1]۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے۔ تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تیرا اپنا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو[2]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) جیسی کچھ خوشی اس کو ہوگی، اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ کو اپنے بھٹکے ہوئے بندے کے پلٹ آنے سے ہوتی ہے۔ دوسری مثال اس سے بھی زیادہ موثر ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ چھوٹ گیا تھا اور وہ ماتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پا لیتی اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا کیا تم لوگ یہ توقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی؟ ہم نے عرض کیا ہرگز نہیں، خود پھینکنا تو درکنار، وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک تو اسے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔ فرمایا اللہ ارحم بعبادہ من ھذہ بولدھا۔ "اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے۔"

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ سمجھ میں نہ آنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ حضرت شعیبؑ کسی غیر زبان میں کلام کرتے تھے، یا ان کی باتیں بہت مغلق اور پیچیدہ ہوتی تھیں۔ باتیں تو سب صاف اور سیدھی ہی تھیں اور اسی زبان میں کی جاتی تھیں جو یہ لوگ بولتے تھے۔ لیکن ان کے ذہن کا سانچا اس قدر ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ حضرت شعیبؑ کی سیدھی باتیں کسی طرح اس میں نہ اتر سکتی تھیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جو لوگ تعصبات اور خواہش نفس کی بندگی میں شدت کے ساتھ مبتلا ہوتے ہیں اور کسی خاص طرز خیال پر جامد ہو چکے ہوتے ہیں، وہ اول تو کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتے جو ان کے خیالات سے مختلف ہو، اور اگر سن بھی لیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس دنیا کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

[2] یہ بات پیش نظر رہے کہ بعینہٖ یہی صورت حال ان آیات کے نزول کے وقت مکہ میں درپیش تھی۔ اس وقت قریش کے لوگ بھی اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں لیکن صرف اس وجہ سے آپ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ بنی ہاشم آپ کی پشت پر تھے۔ پس حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کا یہ قصہ ٹھیک ٹھیک قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ پر چسپاں کرتے ہوئے بیان کیا

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

شعیب نے کہا "بھائیو! کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا، جلدی ہی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ چشم براہ ہوں"۔

آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیبؑ اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے۔

سنو! مدین والے بھی دور پھینک دیے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے۔ ع ۸

اور موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی کھلی سند ماموریت کے ساتھ[1] فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور اپنی پیشوائی میں انھیں دوزخ کی طرف لے جائے گا،[2] کیسی بدتر جائے ورود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) جا رہا ہے، اور آگے حضرت شعیب کا جو انتہائی سبق آموز جواب نقل کیا گیا ہے اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ اے قریش کے لوگو! تم کو بھی محمدؐ کی طرف سے یہی جواب ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی ایسی صریح علامات کے ساتھ جو ان کے مامور من اللہ ہونے کا ثبوت تھیں

[2] اس آیت سے اور قرآن مجید کی بعض دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں کسی قوم یا جماعت کے رہنما ہوتے ہیں وہی قیامت کے روز بھی اس کے رہنما ہوں گے۔ اگر وہ دنیا میں نیکی اور سچائی اور حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں تو جن لوگوں نے یہاں ان کی پیروی کی ہے وہ قیامت کے روز بھی انہی کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے اور ان کی پیشوائی میں جنت کی طرف جائیں گے۔ اور اگر وہ دنیا میں کسی ضلالت، کسی بد اخلاقی یا کسی ایسی راہ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں جو دین حق کی راہ نہیں ہے، تو جو لوگ یہاں ان کے پیچھے چل رہے ہیں وہ وہاں بھی ان کے پیچھے ہوں گے اور انہی کی سرکردگی میں جہنم کا رخ کریں گے۔ اسی مضمون کی ترجمانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں پائی جاتی ہے کہ امرؤ القیس حامل لواء شعراء الجاھلیۃ الی النار، یعنی قیامت کے روز جاہلیت کی شاعری کا جھنڈا امراؤ القیس کے ہاتھ میں ہوگا اور عرب جاہلیت کے تمام شعراء اسی کی پیشوائی میں دوزخ کی راہ لیں گے۔ اب یہ منظر ہر شخص کا اپنا

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

ہے یہ جس پر کوئی پہنچے! اور ان لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی، کیسا برا صلہ ہے یہ جو کسی کو ملے!

یہ چند بستیوں کی سرگذشت ہے جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انھوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا۔ اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود، جنھیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انھوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انھیں کچھ فائدہ نہ دیا۔

اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے، فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے[۱]۔ وہ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) تخیل اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ سکتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے جلوس کس شان سے اپنی منزل مقصود کی طرف جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لیڈروں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کیا اور خلافِ حق راہ پر چلایا ہے ان کے پیرو جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ ظالم ہم کو کس خوفناک انجام کی طرف کھینچ لائے ہیں تو وہ اپنی ساری مصیبتوں کا ذمہ دار انہی کو سمجھیں گے اور ان کا جلوس اس شان سے دوزخ کی راہ پر رواں ہوگا کہ آگے آگے وہ ہوں گے اور پیچھے پیچھے ان کے پیرووں کا ہجوم ان کو گالیاں دیتا ہوا اور ان پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا جا رہا ہوگا۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کی رہنمائی نے لوگوں کو جنت نعیم کا مستحق بنایا ہوگا ان کے پیرو اپنا یہ انجام خیر دیکھ کر اپنے لیڈروں کو دعائیں دیتے ہوئے اور ان پر مدح و تحسین کے پھول برساتے ہوئے چلیں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی تاریخ کے ان واقعات میں ایک ایسی نشانی ہے جس پر اگر انسان غور کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ عذاب آخرت ضرور پیش آنے والا ہے اور اس کے متعلق پیغمبروں کی دی ہوئی خبر سچی ہے نیز اسی نشانی سے وہ یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ عذاب آخرت کیسا سخت ہوگا اور یہ علم اس کے دل میں خوف پیدا کرکے اسے سیدھا کر دے گا۔ اب رہی یہ بات کہ تاریخ میں وہ کیا چیز ہے جو آخرت اور اس کے عذاب کی علامت کہی جا سکتی ہے، تو یہ ہر اس شخص کی سمجھ میں بآسانی آسکتی ہے جو تاریخ کو محض واقعات کا مجموعہ ہی نہ سمجھتا ہو

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

دن ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور وہ دن دیکھنے کا ہوگا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ بہت زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں، بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) بلکہ ان واقعات کی منطق پر بھی کچھ غور کرتا ہو اور ان سے نتائج بھی اخذ کرنے کا عادی ہو۔ ہزارہا برس کی انسانی تاریخ میں قوموں اور جماعتوں کا اٹھنا اور گرنا جس تسلسل اور باضابطگی کے ساتھ رونما ہوتا رہا ہے اور پھر اس گرنے اور اٹھنے میں جس طرح صریحاً کچھ اخلاقی اسباب کارفرما رہے ہیں، اور گرنے والی قومیں جیسی جیسی عبرت انگیز صورتوں سے گری ہیں یہ سب کچھ اس حقیقت کی طرف کھلا اشارہ کر رہا ہے کہ انسان اس کائنات میں ایک ایسی حکومت کا محکوم ہے جو محض اندھے طبیعی قوانین کی بنا پر فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ اپنا ایک معقول اخلاقی قانون رکھتی ہے جس کے مطابق وہ اخلاق کی ایک خاص حد سے اوپر رہنے والوں کو جزا دیتی ہے، اس سے نیچے اترنے والوں کو کچھ مدت تک ڈھیل دیتی رہتی ہے اور جب وہ اس سے بہت زیادہ نیچے چلے جاتے ہیں تو پھر انھیں گرا کر ایسا پھینکتی ہے کہ وہ ایک داستان عبرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان واقعات کا ہمیشہ ایک ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے رہنا اس امر میں شبہہ کرنے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں چھوڑتا کہ جزا و مکافات اس سلطنتِ کائنات کا ایک مستقل قانون ہے۔ پھر جو عذاب مختلف قوموں پر آئے ہیں ان پر مزید غور کرنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ازروئے انصاف قانونِ جزا و مکافات کے جو اخلاقی تقاضے ہیں وہ ایک حد تک تو ان عذابوں سے ضرور پورے ہوئے ہیں مگر بہت بڑی حد تک ابھی تشنہ ہیں۔ کیونکہ دنیا میں جو عذاب آیا اس نے صرف اُس نسل کو پکڑا جو عذاب کے وقت موجود تھی، رہیں وہ نسلیں جو شرارتوں کے بیج بو کر اور ظلم و بدکاری کی فصلیں تیار کر کے کٹائی سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اور جن کے کرتوتوں کا خمیازہ بعد کی نسلوں کو بھگتنا پڑا، وہ تو گویا قانونِ مکافات کے عمل سے صاف ہی بچ نکلی ہیں۔ اب اگر ہم تاریخ کے مطالعہ سے سلطنتِ کائنات کے مزاج کو ٹھیک ٹھیک سمجھ چکے ہیں تو ہمارا یہ مطالعہ ہی اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ عقل اور انصاف کی رو سے قانونِ مکافات کے جو اخلاقی تقاضے ابھی تشنہ ہیں، ان کو پورا کرنے کے لیے یہ عادل سلطنت یقیناً پھر ایک دوسرا عالم برپا کرے گی اور وہاں تمام ظالموں کو ان کے کرتوتوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ بدلہ دنیا کے ان عذابوں سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔

کرنے کی مجال نہ ہوگی، الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے[۱]۔ پھر کچھ لوگ اس روز بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے (جہاں گرمی اور پیاس کی شدت سے) وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اس حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں[۲]، الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے، بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے[۳]۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے، تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک

---

[۱] یعنی بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسے میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کرکے ہمیں بچا لیں گے، فلاں بزرگ اڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک متوسل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے، فلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں جنت کے راستے میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے، حالانکہ اڑنا اور مچلنا کیسا، اس پُرجلال عدالت میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی معزز سے معزز فرشتے کو بھی مجال دم زدن تک نہ ہوگی اور اگر کوئی کچھ کہہ بھی سکے گا تو اس وقت جب کہ احکم الحاکمین خود اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیدے۔ پس جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے غیر اللہ کے آستانوں پر نذریں اور نیازیں چڑھا رہے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں بڑا رسوخ و اثر رکھتے ہیں، اور ان کی سفارش کے بھروسے پر اپنے نامۂ اعمال سیاہ کیے جارہے ہیں، ان کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

[۲] ان الفاظ سے یا تو عالم آخرت کے زمین و آسمان مراد ہیں، یا پھر محض محاورے کے طور پر ان کو دوام اور ہمیشگی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال موجودہ زمین و آسمان تو مراد نہیں ہوسکتے کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے یہ قیامت کے روز بدل ڈالے جائیں گے اور یہاں جن واقعات کا ذکر ہو رہا ہے وہ قیامت کے بعد پیش آنے والے ہیں۔

[۳] یعنی کوئی اور طاقت تو ایسی ہے نہیں جو ان لوگوں کو اس دائمی عذاب سے بچا سکے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے انجام کو بدلنا چاہے یا کسی کو ہمیشگی کا عذاب دینے کے بجائے ایک مدت تک عذاب دے کر معاف کردینے کا فیصلہ فرمائے تو اسے ایسا کرنے کا پورا اختیار ہے، کیونکہ اپنے قانون کا وہ خود ہی واضع ہے، کوئی بالاتر قانون ایسا نہیں ہے جو اس کے اختیارات کو محدود کرتا ہو۔

زمین و آسمان قائم ہیں، اِلاّ یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔[۱۰۵] ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔

پس اے نبی! تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے

ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے۔[۱۰۶]

۱۰۹ اور ہم اِن کا حصہ انھیں بھرپور دیں گے بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو؟

ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اِس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمھیں دی گئی ہے)۔[۱۰۷] اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو اِن اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔[۱۰۸] یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی

[۱۰۵] یعنی ان کا جنت میں ٹھیرنا کسی ایسے بالاتر قانون پر مبنی نہیں ہے جس نے اللہ کو ایسا کرنے پر مجبور کر رکھا ہو، بلکہ یہ سراسر اللہ کی عنایت ہوگی کہ وہ ان کو وہاں رکھے گا۔ اور اگر وہ ان کی قسمت بھی بدلنا چاہے تو اسے بدلنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

[۱۰۶] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں تھے، بلکہ دراصل یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے عامۃ الناس کو سنائی جا رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مردِ معقول کو اس شک میں نہ رہنا چاہیے کہ یہ لوگ جو ان معبودوں کی پرستش کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے میں لگے ہوئے ہیں تو آخر کچھ تو انھوں نے دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے یہ ان سے نفع کی امیدیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پرستش اور نذریں اور نیازیں اور دعائیں کسی علم، کسی تجربہ اور کسی حقیقی مشاہدے کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ نری اندھی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آخر یہی آستانے پچھلی قوموں کے ہاں بھی تو موجود تھے، اور ایسی ہی ان کی کرامتیں ان میں بھی مشہور تھیں، مگر جب خدا کا عذاب آیا تو وہ تباہ ہو گئیں اور یہ آستانے یونہی دھرے کے دھرے رہ گئے۔

[۱۰۷] یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج اس قرآن کے بارے میں مختلف لوگ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں بلکہ اس سے پہلے جب موسیٰ کو کتاب دی گئی تھی تو اس کے بارے میں بھی ایسی ہی مختلف رائے زنیاں کی گئی تھیں، لہٰذا اے محمد، تم یہ دیکھ کر بددل اور شکستہ خاطر نہ ہو کہ ایسی سیدھی سیدھی اور صاف صاف باتیں قرآن میں پیش کی جا رہی ہیں اور پھر لوگ ان کو قبول نہیں کرتے۔

[۱۰۸] یہ فقرہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کے لیے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلافات کر رہے ہیں ان کا فیصلہ جلدی سے چکا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ فیصلہ وقتِ مقرر سے پہلے نہ کیا جائے گا، اور یہ کہ دنیا کے لوگ فیصلہ چاہنے میں جو جلدی بازی کرتے ہیں، اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلدی بازی نہ کرے گا۔

طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہی واقعہ ہے کہ تیرا رب انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا، یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔ پس اے محمدؐ! تم اور تمھارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے، اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو، جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمھارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور دیکھو، نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گذرنے پر[1]۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں[2]، یہ ایک یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔ اور صبر کر، اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

پھر کیوں نہ اُن قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا ورنہ ظالم لوگ تو انھی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انھیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے

---

[1] دن کے دونوں سروں پر سے مراد صبح اور مغرب ہے، اور کچھ رات گذرنے پر سے مراد عشا کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اُس زمانے کا ہے جب نماز کے لیے پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز کا ضابطہ قائم کرنے میں بھی تدریج سے کام لیا گیا تھا۔

[2] یعنی جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، اور جو برائیاں تمھارے ساتھ اس دعوتِ حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں، ان سب کو دفع کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے اس بدی کو شکست دو۔ اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی جن سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے۔

باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔[1] بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور ان بے راہ رویوں سے صرف وہی

[1] ان آیات میں نہایت سبق آموز طریقے سے ان قوموں کی تباہی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تاریخ پچھلے چھ رکوعوں میں بیان ہوئی ہے۔ اس تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ صرف انہی قوموں کو نہیں، بلکہ پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخرکار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں، ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھلے کام کر رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے۔ اس ارشاد سے یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:-

ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے۔ اور لوگوں کے شرور کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو، اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریر لوگ ہی باقی رہ جائیں، یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی سن کر نہ دے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے، تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر صرف انہی چند گنے چنے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے اور بھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں تو سمجھ لو کہ اس کے برے دن قریب آ گئے ہیں، کیونکہ اب وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے، اسے وہ سب چیزیں تو محبوب ہیں جو اس کی ہلاکت

(باقی صفحہ ۳ پر)

لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادیِ انتخاب و اختیار) کے لیے ہی تو اس نے انھیں پیدا کیا تھا۔سلہ اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جن اور انسان سب سے بھر دوں گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) کی موجب ہیں اور صرف وہی ایک چیز گوارا نہیں ہے جو اس کی زندگی کی ضامن ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دعوتِ خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظامِ صالح کو قائم کرنے کے لیے کافی ہو تو اس پر عذابِ عام نہیں بھیجا جاتا بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاحِ حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیہم سعی و جہد کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کے لیے کافی ہو سکیں اور وہ قوم اپنی گود سے چند ہیرے پھینک دینے کے بعد اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتی ہے کہ اب اس کے پاس کوئلے ہی کوئلے باقی رہ گئے ہیں تو پھر کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ بھٹی سلگا دی جاتی ہے جو ان کوئلوں کو پھونک کر رکھ دے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) سلہ یہ اس شبہہ کا جواب ہے جو بالعموم ایسے مواقع پر تقدیر کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اوپر اقوامِ گذشتہ کی تباہی کا جو سبب بیان کیا گیا ہے اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا تھا کہ ان میں اہلِ خیر کا موجود نہ رہنا یا بہت کم پایا جانا بھی تو آخر اللہ کی مشیت ہی سے تھا، پھر اس کا الزام ان قوموں پر کیوں رکھا جائے؟ کیوں نہ اللہ نے ان کے اندر بہت سے اہلِ خیر پیدا کر دیے؟ اس کے جواب میں یہ حقیقت حال صاف صاف بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کی مشیت انسان کے بارے میں یہ ہے ہی نہیں کہ حیوانات اور نباتات اور ایسی ہی دوسری مخلوقات کی طرح اس کو بھی جبلی طور پر ایک لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے۔ اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو پھر دعوتِ ایمان، بعثتِ انبیاء، اور تنزیلِ کتب کی ضرورت ہی کیا تھی، سارے انسان مسلم و مومن ہی پیدا ہوتے اور کفر و عصیان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا۔ لیکن اللہ نے انسان کے بارے میں جو مشیت فرمائی ہے وہ تو یہ ہے ہی یہ کہ اس کو انتخاب و اختیار کی آزادی بخشی جائے۔ اسے اپنی پسند کے مطابق مختلف راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے۔ اس کے سامنے جنت اور دوزخ دونوں کی راہیں کھول دی جائیں اور پھر ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کو موقع دیا جائے کہ وہ ان میں سے جس راہ کو بھی اپنے لیے پسند کرے اس پر چل سکے تاکہ ہر ایک جو کچھ بھی پائے، اپنی سعی و کسب کے نتیجہ میں پائے۔ پس جب وہ اسکیم جس کے تحت انسان پیدا کیا گیا ہے، آزادیِ انتخاب اور اختیاری کفر و ایمان کے اصول پر مبنی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم خود تو بڑھنا چاہے

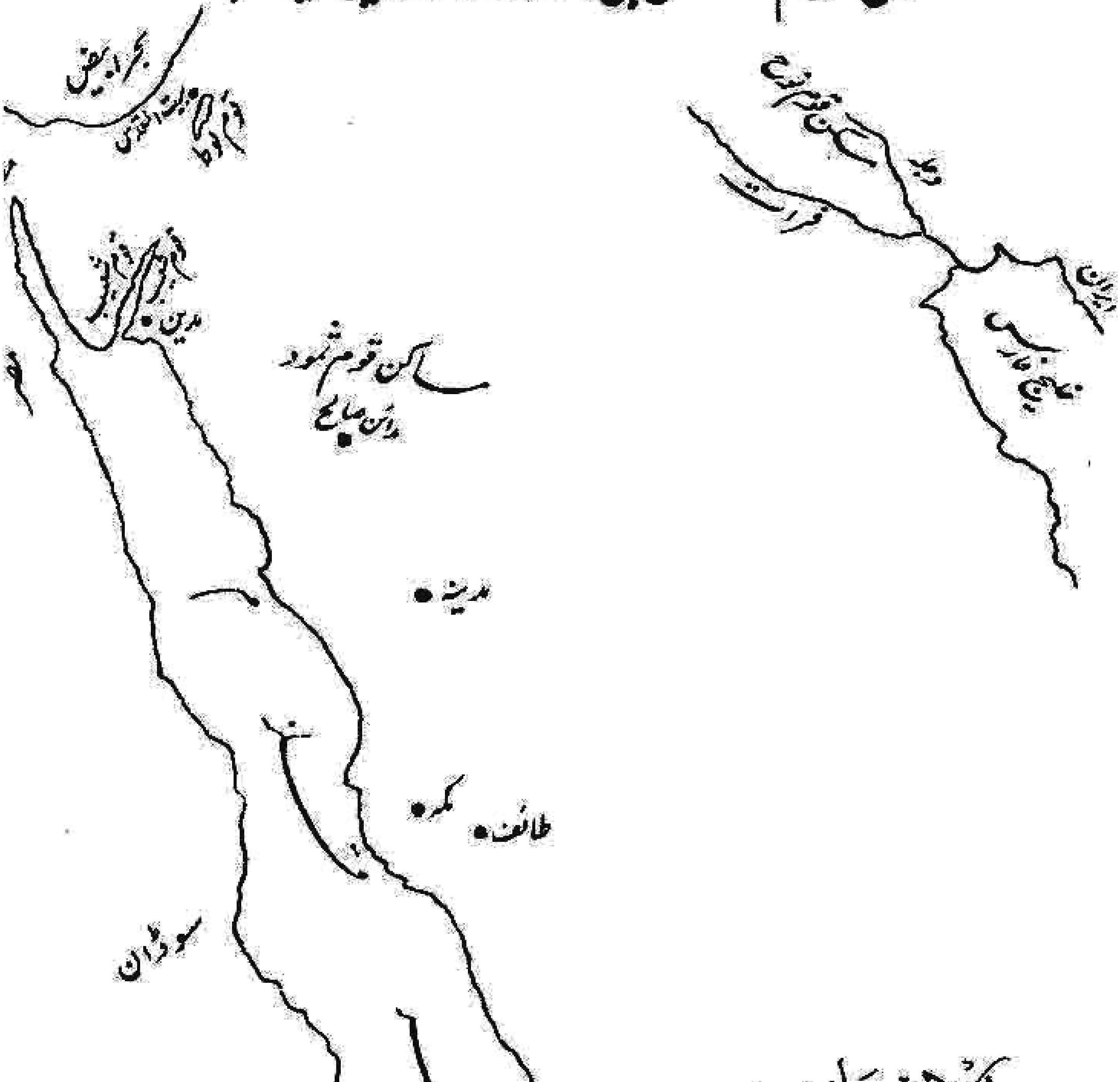
(باقی صفحہ ۴۳ پر)

اور اے محمدؐ! یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمھیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، تو ان سے کہدو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں، انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبی! تو اس کی بندگی کر
اور اسی پر بھروسا رکھ، جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو تیرا رب اس سے بے خبر[1] نہیں ہے۔ ع۱۰

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) بدی کی راہ پر اور اللہ بزور ہستی اس کو خیر کے راستے پر موڑ دے، یا کوئی قوم خود اپنے انتخاب سے تو انسان سازی کے وہ کارخانے بنائے جو ایک سے ایک بڑھ کر بدکار اور ظالم اور فاسق آدمی ڈھال ڈھال کر نکالیں، اور اللہ اپنی براہ راست مداخلت سے اس کو وہ پیدائشی نیک انسان مہیا کر دے جو اس کے بگڑے ہوئے سانچوں کو ٹھیک کر دیں۔ اس قسم کی مداخلت خدا کے دستور میں نہیں ہے۔ نیک ہوں یا بد، دونوں قسم کے آدمی ہر قوم کو خود ہی مہیا کرنے ہوں گے۔ جو قوم بحیثیت مجموعی بدی کی راہ کو پسند کرے گی، جس میں سے کوئی معتدبہ گروہ ایسا نہ اٹھے گا جو نیکی کا جھنڈا بلند کرے، اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں اس امر کی گنجائش ہی نہ چھوڑی ہوگی کہ اصلاح کی کوششیں اس کے اندر پھل پھول سکیں، خدا کو کیا پڑی ہے کہ اس کو زبردستی نیک بنائے۔ وہ تو اس کو اسی انجام کی طرف دھکیل دے گا جو اس نے خود اپنے لیے انتخاب کیا ہے۔ البتہ خدا کی رحمت کی مستحق اگر کوئی قوم ہو سکتی ہے تو صرف وہ جس میں بہت سے افراد ایسے نکلیں جو خود دعوت خیر کو لبیک کہنے والے ہوں اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں یہ صلاحیت باقی رہنے دی ہو کہ اصلاح کی کوشش کرنے والے اس کے اندر کام کر سکیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یعنی کفر و اسلام کی اس کشمکش کے دونوں فریق جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کی نگاہ میں ہے۔ اللہ کی سلطنت کوئی اندھیر نگری چوپٹ راجہ کی مصداق نہیں ہے کہ اس میں خواہ کچھ ہی ہوتا رہے شہ بے خبر کو اس سے کچھ سروکار نہ ہو۔ یہاں حکمت اور بردباری کی بنا پر دیر تو ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ جو لوگ اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں وہ یقین رکھیں کہ انکی محنتیں ضائع نہ ہونگی اور وہ لوگ بھی جو فساد کرنے اور اسے برپا رکھنے میں لگے ہوئے ہیں، جو اصلاح کی سعی کرنے والوں پر ظلم و ستم توڑ رہے ہیں، اور جنھوں نے اپنا سارا زور اس کوشش میں لگا رکھا ہے کہ اصلاح کا یہ کام کسی طرح چل نہ سکے، انھیں بھی خبردار رہنا چاہیے کہ ان کے یہ سارے کرتوت اللہ کے علم میں ہیں اور ان کی پاداش انھیں ضرور بھگتنی پڑے گی۔

اُن اقوام کے مساکن جن کا ذکر سورۂ ہود میں آیا ہے



مقالات

اساسِ دین کی تعمیر

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

جس طرح کسی مکان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک بنیاد ہو جس پر اس کی دیواریں اٹھائی جائیں، اور پھر ان دیواروں پر اس کی چھت تعمیر کی جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بنیاد اتنی گہری اور مضبوط ہو جو دیواروں کا اور چھت کا بار اچھی طرح سنبھال سکے۔ ورنہ وہ مکان ہوا کے ایک تیز جھونکے یا بارش کے کسی تند حملے کی بھی تاب نہ لاسکے گا اور اس کو، خواہ اس کی دیواریں اور چھتیں اپنی جگہ کتنی ہی ٹھوس اور پائیدار کیوں نہ ہوں، ایک کھنڈر کی شکل میں تبدیل ہو جانے سے کوئی شے بچا نہ سکے گی۔ پس ایک دانا اور انجام شناس انجینیر کبھی اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا کہ جس جسامت اور وزن کی دیواریں اور چھتیں بنانی ہوں اسی کے تناسب سے بنیاد میں گہرائی اور پائیداری کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اگر ایک پھوس کا چھپر بنانا ہے تو کچی اینٹوں کی فٹ دو فٹ گہری بنیاد بلکہ لکڑی کے معمولی کھمبے، جو بالشت دو بالشت زمین میں گڑے ہوں، اس کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی اوسط درجے کے مکان کی تعمیر پیش نظر ہو تو اس کے لیے کم از کم دو تین فٹ گہری اور تقریباً اتنی ہی چوڑی بنیاد اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن اگر ایک وسیع اور عالی شان محل تعمیر کرنا ہو جس کی دیواروں اور چھتوں میں لکڑی، بانس، کچی اینٹ اور پھوس، کھپڑے یا سلیٹ کے بجائے پختہ اینٹیں، سمنٹ اور لوہے کی سلاخیں اور گرڈر چنے جانے والے ہوں تو لامحالہ اس کی بنیادیں بھی کئی فٹ گہری اور چوڑی بنانی پڑیں گی، اور ان میں مٹی یا کچی اینٹیں نہیں بلکہ وہی پختہ اینٹیں اور سمنٹ اور آہنی سلاخیں دینی ہوں گی۔ ایک پاگل ہی یہ تصور کر سکتا ہے یا عملاً ایسی حرکت کر سکتا ہے کہ جاتو رہا ہے اہرام مصری کو شرما دینے والی عمارت بنانے اور اس کے لیے بنیاد کھودی ہو دانگلیوں اور انچوں سے ناپ کر۔

اب ذرا اسی اصول کو لیے ہوئے محسوسات کی دنیا سے نکل کر معانی اور معقولات کے عالم میں آئیے۔ اس عالم میں اس اصول کی اہمیت اور ناگزیری عالم محسوسات کے مقابلہ میں اتنی ہی زیادہ سزاوار ترجیح ہے جتنی خود عقل و معنی حس کے، اور روح جسم کے مقابلہ میں۔ یہ اس لیے کہ اگر وہاں اس اصول کو فراموش کر دینے کا نتیجہ اینٹ اور چونے کی ایک عمارت کی تباہی اور چاندی کے چند سکوں کی بربادی کی شکل میں نکلتا ہے تو یہاں بسا اوقات ساری زندگی کی جاں فشانیوں اور قربانیوں ہی پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور یہ اتنی بڑی اندوہناک ٹریجڈی ہے جس سے بچنے کے لیے کوئی ہوشمند انسان اپنی کسی ممکن سعی سے دریغ نہیں کر سکتا۔ وہ کسی اہم انقلابی مقصد کے حصول اور کسی زبردست اصلاحی اسکیم کے قیام و نفاذ کے سلسلہ میں سب کچھ بھول سکتا اور ہر شئے سے اغماض برت سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا ذہن اس کی بنیاد کی صحیح تاسیس سے غافل ہو جائے۔ وہ اپنی تمام تر مساعی کا اولین ہدف اسی ایک چیز کو بنانے پر مجبور ہے کہ جس مقصد اور نصب العین کو لے کر وہ اٹھا ہے اس کے لیے اس کی وسعت اور عظمت کے مناسب اساس فراہم کرے، یعنی اس کی اساس میں اتنی گہرائی اور پختگی پیدا کر لینے کا اہتمام کرے جو آگے چل کر اس راہ کی مشکلوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ پوری طرح سہار سکے۔

دین حق کی اقامت، جس کے از روئے قرآن تمام اہل ایمان مکلف ہیں، ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایانی اور جس کی ذمہ داریوں کی گرانباری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ دوست اور دشمن، موافق اور مخالف، مومن اور منکر، یگانے اور غیر، سب اس امر واقعی کا یکساں اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اعتراف اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو علانیہ فریب خوردہ بلکہ مجنون کہہ کر کرتے ہیں اور جو یگانے ہیں وہ اس کا اعلان اس کی کامیابی کو "ناممکن" بتا کر فرماتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی، پہلا گروہ مخالف ہونے کے سبب اپنے اس نظریے کو بالکل عریاں لفظوں میں ظاہر کر دیتا ہے اور دوسرا "پاس شریعت" رکھنے کے باعث یا اپنے ادعائے ایمان کی لاج رکھنے کی خاطر اپنے اندر اس بے حجاب جسارت کی تاب نہیں رکھتا اس لیے سیاسی صیقل گری سے کام لیتے ہوئے اپنے اس خیال کو ایک گونہ شائستگی اور خوشنمائی کا رنگ دے کر بیان

کرتا ہے۔ بہرحال جہاں تک اس کام کی دشواریوں اور صبر آزمائیوں کا تعلق ہے۔ سارے اہل جہان یک زبان ہو کر پکارتے ہیں کہ اس وادی جنوں میں قدم رکھنا ہر مرد کا کام نہیں۔ حد یہ ہے کہ اس نظریہ کی صداقت سے نہ تو اس کو انکار ہے جس نے یہ عظیم الشان ذمہ داری اپنے بندوں پر ڈالی ہے اور نہ ہی ان کو جنھیں اس کارِ عظیم کی سربراہ کاری سپرد کر کے اس دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ (صلوات اللہ علیہم اجمعین) بلکہ یہ سب اسے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ اس کو تسلیم کرتے اور اس کا اعلان فرماتے ہیں جتنی صفائی کہ اوروں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ خود اللہ تعالیٰ ہی کے الفاظ ہیں:۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (احزاب - ۹)

ہم نے یہ "امانت" آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی لیکن انھوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ پر انسان نے اس کی ذمہ داری اٹھالی یقیناً وہ بڑا ظالم اور نادان ہے۔

معلوم ہے کہ یہ "امانت" کونسی تھی جس کا بوجھ اٹھانے کے لیے زمین و آسمان اور پہاڑ جیسی قوی ہیکل مخلوقات بھی تیار نہ ہو سکیں اور اس کے تصور ہی سے وہ لرزہ براندام ہو گئیں؟ وہ امانت یہی اللہ تعالیٰ کے قوانین تشریعی کی امانت تھی جن کی خود بھی اطاعت کرنی تھی اور دوسروں سے بھی کرانی تھی یعنی دین الٰہی کی اقامت۔ پھر ان الفاظ کو بھی سامنے رکھ لیجیے جو اس امانت کے آخری ذکر اور دین حق کے آخری علمبردار (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس منصب پر سرفراز کرتے وقت فرمائے گئے تھے:۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (مزمل - ۱) ہم تم پر ایک بھاری کلام (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

یہ "قول ثقیل" کس شے کو کہا گیا ہے؟ واقعات شاہد ہیں، بعد میں نازل ہونے والے احکام بتاتے ہیں اور خود آیت کا سیاق و سباق پکارتا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی وہی کتاب تھی جس کے نزول کا آغاز ہو چکا تھا اور جس میں بتدریج، بنی نوع انسان کے لیے آخری اور مکمل ضابطۂ حیات (دین) ہونے کے باعث ایک ایک شعبۂ زندگی سے متعلق قطعی ہدایات آنے والی تھیں، اس لیے لازماً نبی پر نت نئی ذمہ داریوں کا بارِ گراں پڑنے والا تھا۔

دین حق کی اقامت کے نصب العین کو ایک مشکل ترین فرض قرار دیے جانے پر یہ خدا کی اپنی گواہی ہے، اور زبانِ قال سے ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ رہ گئے انبیائے کرام، تو یہ وہ لوگ ہیں جو اس فرض اور اس نصب العین کے اولین اور براہ راست ذمہ دار ہیں، اس لیے اس کی صبر آزما تلخ کامیوں کا جتنا شدید اور صحیح احساس ان کو ہو سکتا ہے، اوروں کے ذہن کی پرواز بھی وہاں تک ممکن نہیں، مگر چونکہ یہ پاکان خاص اور مردان حق، تسلیم و رضا کے پیکر ہوتے ہیں اس لیے ان کی زبان قال کے لیے تو ممکن نہیں کہ اس سے کسی حرف شکایت کا صدور ہو، مگر زبان حال کی بندش ہرگز ان کی دسترس سے باہر تھی چنانچہ اس زبان نے بارہا درد و کرب سے بھری ہوئی چیخیں بلند کیں تاکہ خدا کا ہاتھ آئے اور ان کی بوجھوں سے دبی ہوئی پشت ناتواں کو سہارا دے حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا۔ یہی خاموش چیخیں ہیں جو آیات ذیل کے پس پشت خود خاتم النبیین صلعم کی زبان حال سے بھی سنائی دے رہی ہیں:۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح)

کیا ہم نے (اے پیغمبر) تمھارے سینے کو (فکر و تردد کے ہجوم سے) نجات نہیں دلائی؟ ہم نے تم پر سے وہ بوجھ اتار کر الگ کر دیا جو تمھاری کمر توڑے دے رہا تھا۔

قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی آیات کا ایک بڑا حصہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی خاطر کے لیے نازل ہوتا رہا ہے۔ آیات ہی نہیں، پوری پوری سورتیں اسی مقصد کو لے کر اتریں۔ جب بھی ایسا ہوا — اور ایسا ہونا کسی صبح بھی غیر متوقع نہ تھا — کہ حالات کی ناسازگاریاں قلب مبارک کو توڑنے لگتیں تو فوراً رحمت الٰہی حرکت میں آتی اور الفاظ قرآن کے لباس میں نمودار ہو کر ٹوٹتے ہوئے دل کو سنبھالتی، ڈھارس بندھاتی اور ایک نئے جوش اور ایک تازہ عزیمت کی توانائیوں سے اسے معمور کر دیتی تاکہ اسی استقلال کے ساتھ تبلیغ و اقامت حق کا کام جاری رہے جو اس کے لیے مطلوب تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک انسان جو اگرچہ افضل البشر اور سرتاج انبیا ہی کیوں نہ تھا، ان ہولناک کشاکشوں اور ناسازگاریوں کے طوفان میں قدم جمائے کھڑا رہ سکتا تھا جو نبوت کے پورے تیئیس سالہ دور میں اس کے اردگرد چھائی رہیں۔ خود قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا ہرگز ممکن نہ تھا:۔

لَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل - ۸۰)

اے محمد! اگر ہم تم کو (جادۂ حق پر) جمائے نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کافروں کی طرف کچھ نہ کچھ ضرور جھک پڑتے۔

چنانچہ قرآن کی تنزیل میں جو اتنی لمبی مدت صرف کی گئی اس کی سب سے بڑی مصلحت بھی یہی تھی کہ منصب رسالت کی ذمہ داریوں میں ایک تدریج کے ساتھ وسعت پیدا کی جائے تاکہ قلب نبوی ان کا بحسن خوبی تحمل کر سکے۔ اگرچہ کفار اشرار نے اس طریقۂ تنزیل کو اپنی دانست میں ایک زبردست اعتراض کا منبع بنایا تھا اور بڑی اونچی آوازوں میں لوگوں کو یہ نفسیاتی مغالطہ دیتے رہے کہ اب تک جتنی آسمانی کتابیں اتری ہیں ان میں سے ہر ایک بیک دفعہ نازل کر دی گئی تھی مگر یہ ایک نئے قسم کی آسمانی کتاب ہے اور غالباً ایک نئے خدا کی جانب سے نازل فرمائی جا رہی ہے کہ مہینے پر مہینے اور سال پر سال گذرتے جا رہے ہیں مگر کتاب ہے کہ اس کا نزول ختم ہونے ہی کو نہیں آتا! حقیقت یہ ہے کہ یہ مدعی نبوت اپنے چند سازشی حواریوں کی مدد سے شبانہ روز کاوشیں اور دماغ سوزیاں کر کے اپنا یہ قرآن "گھڑتا" ہے اور جب کچھ جملے گھڑ پاتا ہے تو اسے وحی الٰہی کے نام سے لوگوں کو سنانے لگتا ہے، وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ..... وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً۔ لیکن حکمت الٰہی نے ان کے ان نفسیاتی مغالطوں کی طرف مطلق توجہ کی، ہاں ان کے لیے، جو کان اور آنکھیں رکھتے تھے، وہ لفظ فرما کر اپنی حکیمانہ مصلحت پر سے پردہ اٹھا دیا:-

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (الفرقان - ۳)

ہاں ہم ایسا ہی کر رہے ہیں تاکہ (اے پیغمبر) تمہارے قلب میں قوت اور جماؤ پیدا کرتے رہیں۔

بس ساری تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ دین حق کی کامل اطاعت اور اس کی تبلیغ و اقامت ہی دنیا کا وہ دشوار ترین فرض ہے جس کی غیر محدود مشکلات کی یکتائی پر پوری کائنات یک زبان ہو کر شہادت دے چکی ہے اور اس شہادت کی سچائی پر اس کائنات کا علیم و خبیر خالق بھی مہر تصدیق ثبت کر چکا ہے۔ ہر چند کہ تپتی اور چمکتی ہوئی دوپہر میں سورج کی طرف انگلی اٹھا کر بتانے اور اس کی شکل و ہیئت پر کسی تبصرہ کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں مگر انسانی نفوس کا عجیب حال ہے جس بات کو ہم نظری حیثیت سے شک و ریب سے بالاتر سمجھتے ہیں، بسا اوقات عمل کی دنیا میں اس کے اولین مقتضیات تک کو

فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ہم دیکھنے کے باوجود بہت سی باتوں کو نہیں دیکھتے اور جاننے کے باوجود جتائے جانے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس لیے ضرورت تھی کہ جو چیز اب تک محض بحث و نظر کی حد تک ہمارے نزدیک مسلّم تھی، اس کو عمل و اقدام کے نقطۂ نگاہ سے دیکھ لیا جائے، اور ایک شخص، جو اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت و رضاجوئی کا عہد کر لینے کے باعث چار و ناچار اقامت دین کے فرض بجا لانے پر مامور ہے، پہلے دن سے اس فرض کی حوصلہ آزما گھاٹیوں کا نقشہ اپنی چشم تصور کے سامنے رکھ لے اور اس طرح رکھے کہ کبھی بھی ان کو سامنے سے اوجھل نہ ہونے دے، ورنہ یقین جانیے کہ ان گھاٹیوں کو پار کرنے کے لیے جو سفر وہ شروع کرے گا اس کے لیے ضروری زادِ راہ کبھی ساتھ نہ لے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی سعی و جہد کے قدم کبھی منزل مقصود سے آشنا نہ ہوں گے۔

اب جب کہ یہ راہ اتنی دشوار گذار اور یہ نصب العین اتنا عزیمت طلب ہے جس کی تفصیل اوپر آپ نے ملاحظہ فرمائی تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس نصب العین کی بنیاد بھی اس انتہائی حد تک عمیق، وسیع اور سنگین رکھی جائے جو اس کے شایان شان ہو اور جو اس بھاری بھرکم آہنی عمارت کی دیواروں اور چھتوں کا پورا بوجھ اٹھا سکے۔ ورنہ اگر جلدبازی یا غفلت سے کام لیتے ہوئے اس بنیاد کو کمزور رہنے دیا گیا اور الٹے سیدھے کچھ سنگریزے یا اینٹ کے ٹکڑے رکھ کر آگے تعمیر شروع کر دی گئی تو اس سلسلہ میں کسی پکی اور مستحکم عمارت بن جانے کی توقع کرنا نتیجۃً اس توقع سے ذرا بھی مختلف نہیں جو ایک پیاسا دور سے چمکتی ہوئی ریت کو دیکھ کر قائم کر لیتا ہے، الّا یہ کہ کسی وقت ہمارے لیے قانون فطرت ہی بدل جائے۔

سنگ ہائے اساس

تعمیر اساس کی اہمیت معلوم کر لینے کے بعد ہمیں اب اصل مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ وہ کون کون سے پتھر ہیں جو اس بنیاد میں نصب کیے جانے چاہئیں اور جن کے بغیر یہ عمارت اپنی مطلوبہ حد کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں خصوصیت کے ساتھ ان آیات و احادیث اور اسلامی تاریخ کے ان اوراق پر نظر ڈالنی چاہیے جن کا تعلق آغاز اسلام یا بالفاظ دیگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ہے، کہ دین حق یا آسمانی بادشاہت کا وہ حسین اور پرجلال ایوان جس کی پیشانی پر مشیت الٰہی نے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کا طغرائے امتیاز دور رسالت کے بالکل آخری لمحوں میں تحریر کیا، اُس کی بنیاد انہی ایام میں ڈالی اور بھری گئی۔ اس بنیاد کے اندر جس کی تعمیر مکمل کرنے میں تیرہ برس کی طویل مدت

صرف ہوگئی۔ محض چند گنے چنے پتھر ہمیں نصب کیے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں، جن کی دو نوعیتیں ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق انسان کے شعور اور اعتقاد سے ہے، دوسرے وہ جن کا تعلق انسان کے عمل سے ہے پہلی قسم ایمان بالله اور ایمان بر آخرت پر مشتمل ہے، اور دوسری قسم میں ذکر الٰہی اور صبر شامل ہیں۔ یہی چار چیزیں ہیں جن کی روح کو دلوں کے اندر اتار دینے اور جن کے لوازم و مطالبات کے مطابق لوگوں کو اپنی زندگی ڈھالنے کے لیے آمادہ کر دینے میں دور رسالت کا نصف سے زائد حصہ صرف ہوگیا۔ اس حقیقت کی تفصیلی شہادت تو کی سورتوں کے صفحات پر دور تک پھیلی نظر آسکتی ہے، لیکن قرآن میں بعض مقامات ایسے بھی آپ کو ملیں گے جہاں یہ حقیقت چند لفظوں میں سمیٹ کر ایسے واضح اور نمایاں طریقہ پر بیان کر دی گئی ہے جس میں کوئی خفا یا ابہام یا اشتباہ نگاہ جستجو کے سامنے حائل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس وقت اسلام کی دعوت انتہائی ناسازگار اور پُرہول منزل سے گذر رہی تھی اور اس کے علمبردار سخت ہولناک حالات سے دوچار تھے، اس وقت مسلمانوں کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو ہدایت کی گئی اس کے الفاظ یہ تھے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَوٰةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔

یہاں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کہہ کر صبر اور نماز کی تلقین کی گئی ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ پیروی حق کے لیے دو قسم کی چیزیں لازم ہیں، ایک تو یہ کہ اعتقادی طور پر الَّذِينَ آمَنُوا یعنی اللہ اور یوم آخرت پر یقین کامل رکھنے والوں میں شرکت ہو، دوسری یہ کہ عملی طور پر صبر اور نماز کی پناہ پکڑی جائے۔ یہ حقیقت آپ کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سورہ طٰہٰ کی ان آیتوں میں نظر آئے گی جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی ہوئی اولین ہدایات اور احکام الٰہی کا (غالباً ایک مجمل) خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے:۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِذِكْرِي

سو جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی اے موسیٰ! (یہ آگ نہیں ہے بلکہ) میں ہوں تیرا رب! پس تم اپنی جوتیاں اتار دو کیونکہ تم اس وقت پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو۔ اور (دیکھو) میں نے تم کو (بار رسالت سنبھالنے کے لیے) چن لیا ہے

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی۔ فَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی

سو اس وقت تم پر جو کچھ وحی کی جا رہی ہے اس کو غور سے سنو۔ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اس لیے میری بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو، یقین رکھو کہ قیامت آکر رہے گی جس کو (ابھی مخلوق کی نگاہوں سے) میں چھپائے رکھوں گا (اور یہ اس لیے) تاکہ ہر جان کو اپنے کیے کا بدلہ مل جائے۔ تو دیکھو وہ لوگ تمھیں اس (یوم الحساب کی فکر) سے باز رکھنے پائیں جو اس کے آنے کا یقین نہیں رکھتے اور اپنی خواہشات نفس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، ورنہ تم اس طرح تباہ ہو جاؤ گے۔

ان آیات پر ابتدائی اساسات دین کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور آگے فرعون کے پاس جا کر اس کی تبلیغ کا حکم مل جاتا ہے۔ دیکھو ان میں بھی انہی چار باتوں کی تلقین کی گئی ہے، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، سب سے پہلے توحید (یعنی ایمان باللہ) کا درس دیا گیا ہے، پھر ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد قیامت کے آنے اور اعمال انسانی کا بدلہ دیے جانے کا یقین لانے کو کہا گیا، اور آخر میں فَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا کہہ کر اس امر کی تاکید کر دی گئی کہ اس راہ حق پرستی سے تمھیں باز رکھنے کے لیے کفر کا اقتدار خواہ کتنا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگائے، تمھیں صبر و استقلال کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ ان ارشادات الٰہی کے اولین اور براہ راست مخاطب خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، رہے بعد میں ان کے ہونے والے پیرو، تو ظاہر ہے کہ اپنے ہادی کی تبعیت میں وہ بھی اسی کے مخاطب ہوں گے۔ جس کا مطلب واضح طور پر یہ ہوا کہ فرائض نبوت انجام دینے کے لیے بھی اور انبیاء کے سچے اتباع کے لیے بھی یعنی دین حق کی اطاعت و اقامت کے لیے بنیادی طور پر جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہی چار چیزیں ہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، یہی وہ بنیادی تعلیمات تھیں جن کو پیغمبر عربی صلعم نے بھی اپنی تعلیم اور تزکیہ کا مرکز بنایا تھا، اس لیے ضرورت ہے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت ماننے والے بھی اپنی نگاہ کو اسی مرکز پر جمائے رہیں، اور اس کامل یقین کے ساتھ جمائے رہیں کہ دین حق کی اقامت کے لیے جس سروسامان کار کی ضرورت ہے اس کی تیاری کے لیے قدرت نے صرف یہی چار "کارخانے" بنائے ہیں۔ دنیا کے دوسرے تمام کارخانوں کے ڈھلے ہوئے کل پرزے میجنو اور سگفرڈ لائنیں تو بنا سکتے ہیں مگر مسجد قبا کا ایک گوشہ بھی تعمیر نہیں کر سکتے۔ اب

جب کہ یہ چیزیں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ہماری کامیاب مساعی کا سارا انحصار ہی انہی پر ہے، ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم ان کے متعلق ایک ایک بات سے پوری واقفیت بہم پہنچالیں اور اچھی طرح یہ جان لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے مطالبات و مقتضیات کیا ہیں؟ یہ اقامت دین کے نصب العین کے حصول میں کیوں ضروری ہیں اور کیونکر اور کس حد تک انسان کو اس کام کے لیے تیار کرتی ہیں اور آخر میں یہ کہ آنحضرت کی زندگی میں ان کی عملی تفصیلات کس نوع کی ہیں؟۔

(۱) **ایمان باللہ** یہ اس بنیاد کا سب سے پہلا پتھر ہے اور اسی لیے سب سے زیادہ اہم بھی ہے، اس قدر اہم کہ اس کے بغیر وجود اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو فی الواقع جس شے کو سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے، وہ یہی ایمان باللہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ صرف دوسرے تمام اصول و احکام اسلامی بلکہ خود مذکورہ بالا وہ تینوں چیزیں بھی، جن کو ہم نے "سنگہائے بنیاد" میں شمار کیا ہے، اس کے مقابلے میں فروع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی موقع بیان اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی ساری صداقتوں کو بیان کرنے کے بجائے کم سے کم لفظوں میں ان کا مغز اور جوہر مخاطب کے سامنے رکھ دیا جائے تو کلام الٰہی اور کلام رسول دونوں ہی میں صرف ایمان باللہ کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور فروع تو فروع، دیگر اصولی ایمانیات کی طرف سے بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن ایک جگہ کہتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ۔

(حٰم السجدہ - ۴)

یقیناً ان لوگوں پر جنھوں نے کہا کہ "ہمارا رب تو اللہ ہے" اور پھر اپنے اس قول پر پوری طرح جمے رہے، فرشتے یہ پیام لے کر اترتے ہیں کہ تمھیں کسی شے کا ڈر ہونا چاہیے نہ کسی چیز کا غم، اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

بعینہٖ یہی بات اور یہی انداز گفتگو پیغمبر صلعم کے ارشادات میں بھی موجود ہے، اور بکثرت موجود ہے، جیسے:

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ

جس نے کہا اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہو

اور یہ اس لیے کہ "ایمان باللہ" کہنے میں تو صرف ایک بات ہے مگر اس پر سے لفظوں کا پردہ اٹھا دیجیے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھیے تو اس کی تہ میں معانی و حقائق دینی کی پوری دنیا آباد نظر آئے گی۔

جس کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی تمام صفات کی صحیح معرفت حاصل ہوگی اس کو پھر نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن آنے والا ہے۔ نہ وہ اس تذکیر کا محتاج ہے کہ اپنے رب اور معبود حقیقی کی یاد سانس کی طرح میری زندگی کا ایک لازمی وظیفہ ہے اور نہ وہ اس تلقین کا منتظر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے مجھے اس کے احکام کی اطاعت میں کسی کمزوری، کسی دل شکستگی اور مشکلات کے مقابلے میں کسی مرعوبیت کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اسی ایک آفتاب کی روشنی میں یمین و یسار کی ساری صداقتیں خود پالے گا۔ چنانچہ اس کی یہی بنیادی اور امتیازی اہمیت ہے جس کے باعث ہر نبی پر انوارِ وحی کا آغاز اسی کی تعلیم سے ہوتا رہا ہے۔ طور کی پہاڑی پر اولین صدا جو آئی وہ یہی تھی کہ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ ..... وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ۔ (موسیٰ! میں ہوں تمھارا پروردگار!...... اور میں نے تمھیں پیام رسانی کے لیے منتخب کرلیا ہے، سو ان باتوں کو غور سے سنو جو تم پر وحی کی جارہی ہیں۔ بالیقین میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پس میری ہی بندگی کرو)۔ غارِ حرا میں سب سے پہلے جو الفاظ گونجے وہ بھی یہی تھے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ — پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا ہے۔

اور جب انبیائے کرام کو یہ حقیقت سب سے پہلے سمجھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو عام انسان کس شمار میں ہیں، وہ تو اور زیادہ اس کے محتاج تھے کہ ان کے کانوں میں سب سے پہلے یہی بات ڈالی جائے اور ان کے دلوں میں پہلے ہی دن اسی کی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بلا استثنا ہر نبی نے اپنی امت کو دعوت حق دینے کا آغاز اسی بات سے کیا کہ:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ — اللہ کی بندگی کرو جس کے سوا تمھارا کوئی معبود حقیقی نہیں

پس ہر اس شخص کے لیے جو دین حق کی اطاعت و اقامت کا فرض ادا کرنے کی سچی نیت رکھتا اور اس کے لیے عملاً سعی و جہد کا آغاز کرنے جا رہا ہو، اولین شرط یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان باللہ کی روح کو پیدا یا بیدار کرے اور اپنے نفس کو ہرگز اس امر کی اجازت نہ دے کہ وہ اپنی پُرفریب تاویلوں اور سخن طرازیوں سے اس کے اندر رسوخ ایمان کا جھوٹا پندار کر کے اس کو اس امر سے غافل کر دے۔ اس زمانہ میں جبکہ

گلی گلی ایسے مذہبی دربار قائم ہیں جہاں سے بالکل عمومی شرطوں پر ایمان صادق کی سندیں اور نجات اخروی کے "پرمٹ" بڑی دریادلی سے تقسیم کیے جا رہے ہیں، ہمارے ذہنوں کا اس امر پر آمادہ ہونا سخت دشوار ہے کہ ہم صاحب ایمان ہونے کا اقرار و اعلان کرنے کے باوجود اپنے اندر ایمان باللہ کی روح کو پیدا اور بیدار کریں، کیونکہ ہم اس خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ ہمارے اندر تو (چشم بد دور) پہلے ہی سے ،بلکہ ہمیشہ سے اسلام و ایمان موجود ہے، پھر ہم سے ایمان باللہ کا مطالبہ کیا معنی ؟ مگر یہ ساری غلط اندیشیاں دراصل نتیجہ ہیں اس بات کا کہ ہم ایمان باللہ کی اس حقیقت سے بالکل اندھیرے میں ہیں جس کا قرآن ہم سے مطالبہ کرتا ہے اور ہم اس ایمان باللہ کو بھی، جس سے آج کے ہر کفر، ہر طاغوت، ہر ابوجہل، ہر قیصر اور ہر کسریٰ کی نہ صرف آشتی ہے بلکہ اس کو ان سب کی "حفاظت اور سرپرستی" حاصل ہے۔ اُسی ایمان باللہ کا ہم پلہ یا زیادہ سے زیادہ اسی کا ہم جنس سمجھتے ہیں جس کو دیکھ کر کبھی چشم باطل میں خون اتر آتا تھا۔ یہ خوش گمانی بلکہ خود فریبی ایک وبائے عام کی طرح ہر چہار سمت پھیلی ہوئی ہے اور ہر دماغ کے قوائے فکر و بصیرت کو ماؤف کیے ہوئے ہے۔ اس مہلک وبا سے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم ایمان کی ترازو، عقائد و کلام کی کتابوں کو بنانے کے بجائے کتاب و سنت کو بنائیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ایمان باللہ کا مطلب اور مقتضا کیا ہے، قرآن کے بیانات سے رہنمائی حاصل کریں، اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ عقائد و کلام کی کتابوں والا ایمان ایک اسلامی اسٹیٹ سے یا کسی مسلم سوسائٹی سے ہمیں اپنے سیاسی اور شہری و معاشرتی حقوق تو دلا سکتا ہے مگر اقامت دین کی راہ میں حائل ہونے والے مصائب کے طوفان سے ہماری کشتی کبھی پار نہیں لگا سکتا۔ یہ توفیق اور قدرت تو اللہ تعالیٰ نے اس ایمان کے لیے مخصوص کر رکھی ہے جو قرآن کی نگاہوں میں ایمان ہے۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آئینہ میں جو قرآن و سنت نے ایمان باللہ کے لوازم و مقتضیات اور مومنین باللہ کی صفات و خصوصیات کی شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے، اپنے ایمان کے خط و خال دیکھیں اور اپنی سیرت و کردار کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ اگر کوئی نقص نظر آئے اور ہم اپنے کو وہ کچھ یا سب کچھ کرتے پائیں جو ایمان باللہ کی روح کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتا تو اس کو اس امر کی علامت سمجھیں کہ ایمان کی روح ہمارے اندر نہیں اتری ہے یا کم از کم یہ کہ اس روح پر غفلت اور پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس

احساس کے بعد ہمارا دوسرا فرض یہ ہو جانا چاہیے کہ اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ اس روح کو اپنے اندر اتارنے اور اس کو از سر نو بیدار و توانا کرنے کی فکر و سعی میں ڈوب جائیں۔ اس سعی کے عملی مناہج کیا ہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا جواب ایک بندۂ مومن کا دل تو بڑی آسانی سے دے سکتا ہے مگر کسی زبان کے الفاظ اس کا تحمل شاید کیا یقیناً نہیں کر سکتے۔ تاہم قرآن اور سنت کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں ہمیں جو روشنی ملتی ہے اس کی رو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مقصودِ گرانمایہ کا حصول چند باتوں کا اہتمام اور التزام تو ضرور ہی چاہتا ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ پر محض رسمی، سمعی اور وراثتی طور پر ایمان رکھنے پر اکتفا کرنا چھوڑ دینا چاہیے یعنی صرف اس بنیاد پر خدا کی ذات و صفات پر ایمان لانا کافی نہ سمجھنا چاہیے کہ جن گھروں میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں اور جس ماحول میں ہماری پرورش ہوئی ہے، وہاں اللہ کو ایک کہا جاتا اور اس کو علم و قدرت، حکمت و حاکمیت، عدل و رحمت اور خلق و امر وغیرہ صفات سے متصف گردانا جاتا تھا اس لیے ہم بھی یہی کہتے اور مانتے ہیں۔ یہ تقلیدی ایمان ہمارے لیے وہ قوت محرکہ نہیں بن سکتا جو ہمارے سینوں کو جوشِ عمل سے معمور کر دے اور جو راہِ حق پرستی سے روکنے والے مادی علائق پر قینچی چلا دیا کرے۔ بلکہ ہمیں اپنی فکر و بصیرت سے کام لے کر اس ایمان کو پا لینے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں اپنی ذاتی معرفت ہو، طمانیت ہو، سنی ہوئی نہیں بلکہ اپنی چشمِ دل کی دیکھی ہوئی حقیقت ہو۔ اس کے لیے قرآن کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے، اس طرح پڑھیے جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اللہ رب العالمین کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی صفات پر فطرت کے جن حقائق سے استشہاد کرتا ہے اور خود انسان کے اپنے نفس کی اور اس پورے کارخانۂ عالم کی جن مسلمہ حقیقتوں کو بطور دلیل پیش کرتا ہے، ان پر دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ غور کیجیے اور برابر کرتے رہیے۔ قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اس غور و فکر کے نتیجہ میں دل کے اندر وہ روشنی پیدا ہو کر رہے گی جو ذات و صفاتِ الٰہی کے متعلق کسی جہل اور شک کی تاریکی باقی نہ رہنے دے گی۔ قرآن پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے کہ وہ آسمان و زمین کی عظیم الشان مخلوقات سے لے کر شہد کی مکھی تک جیسی معمولی اور حقیر چیزوں کا ذکر کر کے اور ان کے اندر اپنے ودیعت کیے ہوئے حیرت انگیز کرشموں کی طرف اشارہ کر کے

کس وثوق کے ساتھ فرماتا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اندر غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے)۔ اور جو لوگ اس کی بیان کی ہوئی ان محکم دلیلوں کے بعد بھی خدا کی وحدانیت کا اذعان اپنے اندر نہیں پیدا کر سکے، ان کے بارے میں وہ جھنجھلا کر کہتا ہے کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے! یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں!)۔

(۲) علمی اور عقلی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت پیدا کر لینے کے بعد اطمینان کی نیند سو نہیں جانا چاہیے، اور جس طرح ہم علوم و فنون کے نکتے حل کر لینے کے بعد ان کو اپنی کتاب معلومات کی زینت بنا کر حفاظت سے رکھ چھوڑتے ہیں، وہ سلوک اس "نکتہ" کے ساتھ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ چاہیے یہ کہ یہ نکتہ فکر و ذکر کا مرکز بن جائے۔ ایک مجسم حقیقت کی شکل میں ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے، ہم کسی حال میں اور کسی جگہ ہوں اس کی یاد سے محروم نہ رہیں اور جہاں تک ہو سکے کوشش کرنی چاہیے کہ یہ نکتہ ہماری یادداشت کو اپنی کامل گرفت میں لے لے، ہم جدھر بھی نگاہ اٹھائیں، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، یہاں تک کہ خالی فضاؤں میں بھی ہمیں یہ حقیقت منقوش نظر آئے، یعنی جس طرح ایک پیاسا پیاس کی شدت میں اپنے گرد و پیش کی ہر موجود شے سے غافل ہو جاتا ہے مگر پانی کی یاد سے، جو فی الواقع اس کے سامنے موجود بھی نہیں ہوتا، غافل نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک مومن کی روح کو چاہیے کہ سب کچھ بھول جائے مگر خدا کو کبھی نہ بھولے۔ یہی راز ہے جس کی بنا پر ایمان باللہ کے سب سے بڑے رمز شناس نے فرمایا ہے کہ:

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ — سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ کا ورد ہے

اور اسی بنا پر اس نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ:

جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ — تم لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کر کے اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہو۔

[یاد رہے کہ اس "ذکر" کا مطلب ذکر کے وہ مصنوعی طریقے نہیں ہیں جو آجکل بالعموم مسلمانوں میں رائج ہیں، بلکہ یہ ذکر فکر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ پر ہم تفصیلی گفتگو ذکر و صلوٰۃ کے عنوان کے تحت کریں گے]

(۳) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا غور و تدبر کے ساتھ صحیح علم حاصل کر لینے اور اس "علم" کو ہر وقت

ذہن میں مستحضر رکھنے سے بھی ایمان باللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ابھی ایک منزل اور طے کرنی باقی ہے، اور یہی منزل اپنے رہروؤں کے لیے وہ بے نظیر خارزار پیش کرتی ہے جس کے کانٹوں سے آج تک کسی تلوے کو واسطہ نہیں پڑا، سوائے ان کے جو دینِ حق کی راہ میں اٹھے۔ کیونکہ اقامتِ دینِ حق کے سوا دنیا کسی ایسے نصب العین سے آج تک واقف نہیں جس کے علمبرداروں کو اس منزل سے گزرنا پڑا ہو۔ اس منزل کا نام ہے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضاجوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم اور ہمارے حافظہ پر تصورِ توحید کی گرفت اگر قائم بھی ہو گئی تو یہ ایمان باللہ کے تحقق کے لیے ہرگز کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے جذبات کو بھی اسی تصور کی گرفت میں دے دیں اور جس طرح وہ ہمارے حواسِ علم و حافظہ پر چھایا ہوا ہے اسی طرح اپنے جذبات پر بھی اسے چھا جانے دیں۔ ورنہ اس کے بغیر ہمارا ایمان ایک بے جان کا لاشہ ہوگا، بغیر بو کا پھول ہوگا، بے نور کا چراغ ہوگا۔ ایسا ایمان اس غایتِ مقصود تک ہمیں کبھی نہیں پہنچا سکتا جس کا نام قیامِ دین ہے۔ جذبات کو غلامی میں دیے بغیر معبودِ حقیقی کی کامل اطاعت نہیں ہو سکتی اور ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مومن کی علامت ہی یہ ٹھیرائی گئی ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتا ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ۔ اور اللہ تعالیٰ علانیہ فرماتا ہے کہ مجھے نرے توحید کے عقلی نکتے بیان کرنے والوں اور صرف علم و نظریہ کی حد تک وحدانیت کے قائل فلسفیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ایسے بندے چاہئیں جو مجھ سے محبت رکھتے ہوں اور جو میری مرضی میں اپنی رضا کو گم کیے ہوئے ہوں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (مائدہ - ۸)	اے ایمان لانے والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو تمھاری جگہ اللہ اور کسی ایسی قوم کو لائے گا جو اس کی محبوب ہوگی اور جو اس سے محبت کرے گی۔

پس اس غلط فہمی میں کسی کو نہ پڑنا چاہیے کہ جس طرح ایک کمیونسٹ مارکس کے پیش کیے ہوئے نظامِ زندگی کو، اور ایک نیشنل سوشلسٹ ہٹلر کے بنائے ہوئے دستور کو اور ایک ہندوستانی وطن پرست گاندھی اور جواہر لال کے تیار کیے ہوئے فلسفۂ حیات کو عقلاً صحیح سمجھ کر ان کی پیروی کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کو ان "مقتداؤں" سے کوئی محبت اور شیفتگی بھی ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام پر بھی عمل کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی

جس کی بنیاد سراسر سادہ لوحی اور حقیقت ناشناسی پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ زندگی رکھتا ہے اور از روئے عقل و تجربہ وہی ایک ایسا نظام زندگی ہے جو فطرت انسانی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور جو دنیا کے امن و فلاح کا ضامن بن سکتا ہے، مگر اس خام خیالی کے لیے عقلی یا نقلی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ محض بطور ایک سیاسی فارمولے کے اللہ تعالیٰ پر یا اس کے دیے ہوئے مسلک حیات پر "ایمان" لا دینا یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ اس مسلک حیات پر عمل کرنا اب ممکن ہو گیا۔ یہ امکان تو صرف وہ محبت پیدا کر سکتی ہے جو ایک سچے مومن کو اس مسلک حیات کے اصل واضع اور اس کی نسبت میں اس کے بھیجے ہوئے نمائندے سے ہوتی ہے۔ اسلام جب ہماری زندگی کا کامل رہنما ہے تو اس میں سیاست کا ہونا بہرحال ضروری ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کل کا کل "سیاست" ہی ہے۔ اس لیے جب تک ایمان باللہ علم و نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر ذوق و وجدان اور جذبات و میلانات تک میں سرایت نہ کر جائے اس راہ کے مسافر کو اپنی کمر نہیں کھولنی چاہیے، ورنہ وہ اپنی ساری تگ و دو ضائع کر دے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کیفیت قلب میں پیدا کس طرح ہو گی تو اس کا آخری انحصار تو بہرحال اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہے، مگر یاد رہے کہ یہ توفیق بھی وہ ایک مستقل اصول کے ماتحت دیتا ہے، اور وہ اصول ہے خود بندہ کی مخلصانہ طلب اور اس کے لیے عملی جد و جہد۔ یہ جد و جہد عبارت ہے کتاب الٰہی کی تلاوت، اس کی آیات پر تدبر، اللہ تعالیٰ کی صفات کمال و جمال میں تفکر، اس کی بے پایاں بخششوں اور نعمتوں اور رحمتوں کے تذکر اور اس کے احکام کی سرفگندانہ اطاعت سے۔

(۴) اس سلسلہ کی آخری چیز ذکر اور نماز ہے، مگر اس پر مفصل گفتگو اپنے موقع پر آئے گی۔

(باقی)

رسائل و مسائل

اسلامی اصولوں پر بنکنگ کی اسکیم

سوال:۔ اسلامی اصول پر ایک غیر سودی بنک چلانے کے لیے ایک اسکیم بھیجی جا رہی ہے اس کو ملاحظہ فرما کر ہماری رہنمائی کیجیے کہ کیا شرعاً یہ اسکیم مناسب ہے یا اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے؟

اسکیم کا خلاصہ:۔

مسلمان زمیندار، تجار اور اہل حرفہ مدتوں سے ساہوکاروں کے پنجے میں پھنستے جا رہے ہیں اور ۲۰، ۲۵ فی صدی تک سود ادا کرتے کرتے تباہ ہو رہے ہیں۔ بڑے تاجر اور زمیندار تو خیر بری بھلی طرح پنپ بھی رہے ہیں لیکن کم استطاعت مسلمانوں کا حال سودی قرضوں نے بہت ہی پتلا کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک مسلم بنک مسلمانوں کو غیر سودی قرض دینے اور زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام کرنے کے لیے قائم ہو۔ ابتداءً ایک ضلع میں اس کا تجربہ کیا جائے اور پھر ملک بھر میں اسے پھیلا دیا جائے۔ مجوزہ بنک کے لیے ذیل میں چند اصول و مبادی درج کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ بنک قانون شریعت کا پورا پورا پابند ہوگا اور مفرد اور مرکب ہر طرح کے سود سے دامن پاک رکھنے کا دعویٰ کرے گا اس بنک سے حاجت مند مسلمانوں کو جائدادی کفالتوں پر اور تجارت پیشہ لوگوں کو مضاربت کے اصول پر کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔ قرض دار کو از روئے معاہدہ اس امر کا پابند ہونا پڑے گا کہ وہ اپنے اموال اور کاروباری سرمایے پر ایک خاص عرصہ تک باقاعدگی سے بنک کو زکوٰۃ ادا کرے۔ اس طریقے سے ایک تو بلا سود سرمایہ حاصل کر کے مسلمان تاجر یا صناع اپنا کاروبار بخوبی چلا سکے گا اور اپنے سرمایہ پر سود ادا کرنے والے غیر مسلم حریفوں کا بخوبی مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا، اور دوسری طرف نظام زکوٰۃ کے احیا میں وہ حصہ دار بنے گا، جس کے مٹ جانے کی وجہ سے ہمارے عوام کی غریبی اور بے روزگاری لا علاج ہو کے رہ گئی ہے۔

(۲) یہ بنک چونکہ بہت ہی سادہ اور پاکیزہ طریق پر عوام سے معاہداتی معاملہ کرے گا، اس لیے یہ

بآسانی ممکن ہے کہ حکومت سے قانونی طور پر اس کی توثیق کرالی جائے۔ ضرورت ہو تو اسمبلی میں بل پیش کیا جاسکتا ہے۔ پہلے زکوٰۃ کی جبری وصولی کے لیے ایک دفعہ حکومت کے سامنے سوال اٹھایا گیا تھا تو یہ اس وجہ سے نامنظور ہوا تھا کہ اس سے مسلمانوں کی "متوازی حکومت" قائم ہوتی ہے۔ لیکن ہماری تجویز کے مطابق زکوٰۃ کی جبری وصولی اس معاہدہ کے زیر اثر ہوگی جو بنک اپنے مقروض سے طے کرے گا۔ کوئی حکومت معاہداتی معاملات کی تصدیق سے انکار نہیں کرسکتی۔

(۳) یہ بنک زکوٰۃ اور دوسرے صدقات کی منظم وصولی کا فریضہ بھی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ انفرادی طور پر زکوٰۃ تقسیم کردینا ایک ناقص طریقہ ہے۔ شریعت اس کا اجتماعی نظم چاہتی ہے۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم پریس اور پلیٹ فارم کو ہماری اس تجویز کی پوری پشت پناہی کرنی چاہیے۔

(۴) اس بنک کا منظور شدہ اور ادا شدہ سرمایہ کم از کم ۵ لاکھ روپے ہوگا جو دس دس روپے کے پچاس ہزار حصص پر مشتمل ہوگا۔ ۴ لاکھ کو سرمایہ مناسب صنعتی کاروبار میں لگا کر کم از کم ۶ فی صدی سالانہ منافع حاصل کیا جاسکے گا۔ بقیہ ایک لاکھ ادنیٰ طبقہ کے مسلمان کاریگروں اور پیشہ وروں کو قرضے دینے کے لیے مخصوص کردیا جائے گا اور ابتداءً قلت سرمایہ کی وجہ سے قلیل مدت کے لیے قرضے جاری کیے جائیں گے۔

انتظامی مصارف کو تجارتی سرمایہ کے منافع کے ۲۵ فی صدی یعنی چھ ہزار روپیہ سالانہ کے اندر اندر پورا کیا جائے گا۔ اخراجات کا تخمینہ حسب ذیل ہے۔

ایک منیجر	۲۰۰ روپیہ ماہوار	۲۴۰۰ سالانہ
ایک اکاؤنٹنٹ	۱۰۰ " "	۱۲۰۰ "
ایک اسٹینوگرافر	۵۰ " "	۶۰۰ "
دو کلرک	۳۰ " "	۷۲۰ "
دو چپراسی	۲۰ " "	۴۸۰ "
متفرق مصارف		۱۲۰ "
میزان		۶۰۰۰ روپے سالانہ

پہلے سال چند ہزار روپے خرچ ہو، ٹائپ مشینوں اور آہنی الماریوں وغیرہ پر بھی صرف ہوں گے۔ اس لیے چار لاکھ کے کاروباری سرمایہ پر متوقعہ ۷ فی صدی منافع میں سے ۲ فی صدی الگ کر کے بھی ہم ۵ فی صدی حصہ داروں میں تقسیم کر سکیں گے، اور اگر ان امانتوں کا منافع بھی محسوب کیا جائے جو ہمارے بنک کے حوالے کی جائیں گی تو یقیناً حصہ داروں کو زیادہ منافع ملے گا۔

زکوٰۃ کی رقم کو ٹھیک ٹھیک شرعی مصارف پر صرف کیا جائے گا اور دوسرے صدقات بھی مسلمان عوام کی بہبود کے لیے ڈائرکٹروں کی "شوریٰ" کے مشورے سے خرچ کیے جائیں گے۔ ڈائرکٹروں کی تجویز کے مطابق منافعوں کا ایک مناسب حصہ فلاح عامہ کے فنڈ میں بھی شامل ہوتا رہے گا۔ "شوریٰ" صرف ایسے اصحاب پر مشتمل ہوگی جو با اثر ہوں اور مختلف طبقات کے مفاد کی نمائندگی کر سکیں۔

(۵) بنک اس کا مجاز ہوگا کہ میعادی امانتوں (fixed deposits) کی جو رقمیں اس کے پاس ہوں انھیں صنعتی، تجارتی اور زرعی بیوپاروں میں لگا کر منافع حاصل کرے۔ ایسے منافع میں سے ایک حصہ امانت داروں کو تقسیم کر دیا جائے گا تاکہ لوگوں میں ہمارے پاس امانتیں رکھوانے کی طرف رغبت پیدا ہو۔

ہمارے بنک کے امتیازات یہ ہوں گے:۔

(ا) اس کی اساس لوٹ کھسوٹ کی خواہش پر نہیں بلکہ خدمت اور تعاون کے جذبہ پر ہوگی اور اس وجہ سے اس کی کشش ہر اس شخص کے لیے ہے جو نفع اندوزی کی جگہ خدمت کرنا چاہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم۔

(ب) یہ بنک ان لوگوں سے بھی زکوٰۃ جمع کرنے کی کوشش کرے گا، جو بنک کے مقروض نہ ہوں۔ مگر زکوٰۃ کو اجتماعی نظم کے ساتھ ادا کرنا چاہیں۔

(ج) "میعادی امانتوں" پر یہ بنک سود نہیں دے گا بلکہ اس کے بجائے ان امانتوں کو کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کرے گا اور اس کا حصہ امانت داروں کو دے گا۔

جواب: غیر سودی بنک کی یہ تجویز بجائے خود تو بہت مبارک ہے، اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ

اس کا تجربہ ضرور کیجیے، لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس کاروبار کو زکوٰۃ و صدقات کے ساتھ خلط ملط کر دینا مناسب نہیں ہے۔ کاروباری ادارہ لازماً کاروباری نوعیت ہی کی فکر، صلاحیت اور مصروفیت چاہتا ہے۔ اور خیراتی ادارہ بالکل ایک دوسرے طرز کی فکر، صلاحیت اور مصروفیت کا طالب ہے۔ ان دونوں چیزوں کو خلط ملط کر دینے سے اندیشہ ہے کہ یا تو خیرات کا پہلو نقصان اٹھائے گا یا کاروبار کا پہلو۔ لہٰذا اگر آپ زکوٰۃ و صدقات کی تنظیم چاہتے ہیں تو اس کے لیے الگ انتظام سوچیے اور اس غرض کے لیے ایک مستقل ادارہ بنائیے۔ جہاں تک اس کے انتظامی مصارف کا تعلق ہے اس کا سوال شریعت نے خود ہی پہلے سے حل کر رکھا ہے۔ زکوٰۃ کی تحصیل اور خرچ کا انتظام کرنے والوں کو شرعاً مال زکوٰۃ سے تنخواہیں لینے کا حق ہے۔

بینک کے کام میں زکوٰۃ و صدقات کی وصولی اور خرچ کو شامل کر دینے سے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ دینے والے بینک میں اپنی زکوٰۃ اس لالچ سے داخل کرائیں گے کہ وہاں سے ان کو قرضے حاصل کرنے میں آسانی ہو اور یہ چیز اُس ذہنیت کے بالکل خلاف ہے جس کے تحت ایک مسلمان کو زکوٰۃ دینی چاہیے۔

بینک کے لیے تو مناسب صورت یہی ہے کہ اس کو بالکل کاروباری اغراض کے لیے کاروباری طریقہ پر چلایا جائے۔ مختصراً اس کے اصول حسب ذیل ہونے چاہئیں:-

(۱) اس کا سرمایہ دو طریقوں سے حاصل ہو۔ ایک شرکاء کے حصص (Shares)، دوسرے ان لوگوں کی امانتیں (Deposits) جو سود نہیں لینا چاہتے۔

(۲) وہ تین قسم کے کام کرے۔ ایک مختلف صنعتی اور تجارتی کاموں کو سرمایہ فراہم کرنا اور "حصہ داری" کے اصول پر ان کے منافع میں سے اپنا مناسب حصہ وصول کر لینا۔ دوسرے بینک کاری کی وہ ساری جائز خدمات انجام دینا جو آج کل بینک عموماً انجام دیا کرتے ہیں اور ان کی فیس وصول کرنا۔ تیسرے حاجت مند لوگوں کو قابل اطمینان ضمانتوں یا جائداد کی کفالتوں پر غیر سودی قرض دینا۔

(۳) ان میں سے پہلی دو مدوں سے جو آمدنی حاصل ہو وہ بینک کے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد حصہ داروں اور امانت داروں، دونوں قسم کے لوگوں میں متناسب طریقہ پر تقسیم کر دی جائے۔

(۴) اس بینک میں روپیہ رکھوانے اور اس کے حصص خریدنے کے لیے تین محرک کافی ہیں، ایک

سود سے بچنے کی خواہش، دوسرے حلال منافع حاصل کرنے کی توقع، تیسرے اپنے مال کے تحفظ کا اطمینان۔

چند معاشی اور کاروباری مسائل

سوال:۔ ہم نے غلہ کی ایک دوکان کھول رکھی ہے۔ موجودہ کنٹرول سسٹم کے تحت شہروں میں جمعیت ہائے تاجران غلہ (Food Grain Associations) قائم ہیں۔ ان جمعیتوں کو حکومت کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ وہ اپنی "فوڈگرین سنڈیکیٹس" بنائیں۔ گورنمنٹ ہر سنڈیکیٹ کو اشیائے خوردنی کے پرمٹ دے گی اور آئندہ غلہ کا سارا کاروبار صرف سنڈیکیٹ ہی کی معرفت ہوا کرے گا۔ نفع نقصان سب حصہ داروں پر تقسیم ہوجایا کرے گا۔ چنانچہ ہمارے شہر میں ایسی سنڈیکیٹ بن چکی ہے۔ پورے شہر کے غلہ کا کاروبار کئی لاکھ کا سرمایہ چاہتا ہے اور پورا سرمایہ چونکہ سنڈیکیٹ کے شرکا فراہم نہیں کرسکتے، لہٰذا بینک سے سودی قرض لیں گے اور اس سودی قرض کی غلاظت سے جملہ شرکا کے ساتھ ہمارا دامن بھی آلودہ ہوگا۔ ہم نے اس سے بچنے کے لیے یہ صورت سوچی ہے کہ ہم اپنے حصہ کا پورا سرمایہ نقد ادا کردیں اور بینک کے قرض میں حصہ دار نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر پورے کاروبار کو سنڈیکیٹ سنبھالنے کے قابل نہ ہوئی تو شاید سنڈیکیٹ ایسے سوداگر مقرر کردے جنھیں ایک چوتھائی سرمایہ سنڈیکیٹ دے گی اور بقیہ تین چوتھائی سوداگر اپنی گرہ سے لگائے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ وہ ضروری سرمایہ بینک سے قرض لے جس کا سود سنڈیکیٹ ادا کرے گی۔ اگر یہ صورت ہوئی تو ہمارا ارادہ ہے کہ ہم پورے کا پورا سرمایہ اپنی گرہ سے لگائیں گے اور بینک کے قرض اور سود سے اپنا کاروبار گندہ نہ ہونے دیں گے۔ ہماری ان دونوں تجویزوں کو سنڈیکیٹ نے قبول کرلیا ہے کہ ان میں سے جو شکل بھی ہم چاہیں اختیار کرسکتے ہیں۔ اس معاملہ میں جتنے لوگوں سے ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی اور ہمیں اپنے نصب العین کو ان پر واضح کرنے کا موقع ملا وہ سب ہمارے اصول کی بہت قدر کررہے ہیں۔ تمام بیوپاری ہندو ہیں اور بہت حیران ہیں کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ اپنے

اصول کی خاطر ہر فائدہ کو چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ ان پر ہمارے اس رویہ کا اخلاقی اثر اس درجہ گہرا ہوا ہے کہ اب وہ ہر کام میں ہم سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور ہم پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ ایک تازہ مثال یہ ہے کہ حال میں ایک جگہ سے دس ہزار بوری گندم خریدنے کا فیصلہ ہوا، ایک ہندو بیوپاری کو خریداری کے لیے مقرر کیا گیا، مگر ایسوایشن کا اصرار تھا کہ اس کے ساتھ ہم میں سے بھی کوئی جائے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمیں کاروبار کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہے مگر ان کی ضد قائم رہی۔ آخر راقم الحروف کا جانا طے ہوگیا۔ بعد میں جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو ان میں سے ایک شخص نے صاف کہا کہ اور جو کوئی بھی جائے گا کسی نہ کسی قسم کی بے ایمانی کرے گا مگر آپ لوگوں میں سے جو گیا وہ نہ خود بے ایمانی کرے گا نہ دوسرے کو کرنے دے گا۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل امور کے متعلق آپ کی ہدایت درکار ہے:۔

(۱) سردست تو ہمارا اور ان غیر مسلم تاجروں کا ساتھ نبھ رہا ہے لیکن آگے چل کے اگر یہ ساتھ نہ نبھ سکا تو پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنی ایک الگ "مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن" بنالیں اور خدا کی نافرمانی سے ہر ممکن حد تک بچ کر اپنا کاروبار چلائیں؟

(۲) ہندو مسلم مخاصمت کی وجہ سے یہاں کی فضا عدد درجہ خراب ہے اور چونکہ مارکیٹ پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اس لیے مسلمانوں کو ضروریات زندگی حاصل کرنے میں تکلیف پیش آرہی ہے۔ ان حالات میں ایک مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے حصہ کا پورا کوٹا اسی کو ملے۔ ہمیں بعض اصحاب مشورہ دے رہے ہیں کہ تم بھی اس میں شامل ہوجاؤ۔ مگر ہمیں اس کے اندر قوم پرستانہ کشمکش کی بو محسوس ہوتی ہے اور اسی بنا پر ہم اس سے پرہیز کر رہے ہیں۔ کیا یہ رویہ ہمارے لیے مناسب ہے؟

(۳) بعض ہندو حضرات جو ہمارے اصول و اخلاق کے قدردان ہیں ہمیں باخلاص یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اگر بینک سے آپ لوگ معاملہ نہ کریں گے تو سنڈیکیٹ کے ساتھ آپ کے لیے کام کرنا مشکل ہوجائے گا بلکہ علیحدہ ہو کر بھی آپ کاروبار نہ چلا سکیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا

صورت پیش آجائے تو ہم کیا کریں؟ کیا اضطراراً بینک سے معاملہ کریں؟

(۴) پنجاب انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے فیکٹری لگانے والوں کو سالانہ گرانٹ ملتی ہے، اس وجہ سے ...... کہ گورنمنٹ انڈسٹری کو فروغ دینا چاہتی ہے۔ ہمارے ہاں کھڈیوں کا کارخانہ بھی ہے۔ ایک دوست کا مشورہ ہے کہ ہم بھی حکومت سے گرانٹ کی درخواست کریں مگر ہمیں شک ہے کہ ارکان جماعت ہوتے ہوئے ہم ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی شرکت میں سود سے بچنے کا جو اہتمام کیا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیے۔ اگرچہ اس میں بہت سے نقصانات کے اندیشے آپ کے سامنے آئیں گے اور بہت سے فائدے بھی ہاتھ سے جاتے محسوس ہوں گے مگر مآل کار میں اس کے اتنے فائدے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہ صرف آپ کی اپنی عاقبت درست ہوگی، بلکہ ان شاء اللہ بہت سے دوسرے بندگان خدا کو بھی ہدایت نصیب ہوگی۔ آپ نے خود بھی چند ہی روز کے تجربے سے دیکھ لیا ہے کہ اگر مسلمان ٹھیک ٹھیک اسلامی اصولوں پر کام کرے تو اس کا کیسا زبردست اخلاقی اثر اس کے پورے ماحول پر چھا جاتا ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کے جوابات حسب ذیل ہیں:

(۱) اگر کبھی غیر مسلم شرکا سے آپ کا ساتھ نہ نبھ سکے اور آپ کو اپنی الگ تجارتی جمعیت بنانی پڑے تو اس کا نام "مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن" رکھنے کے بجائے Fair dealers association یا اسی طرح کا کوئی دوسرا اردو یا انگریزی نام رکھیے، اور اس میں شرکت کے لیے انصاف و دیانت کے چند ایسے اصول مقرر کیجیے جن کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ یہی انصاف ہے اور اسی کا نام ایمانداری ہے، مثلاً یہ کہ سود نہ لیں گے نہ دیں گے، سٹہ نہ کریں گے، ایک مقرر فی صدی سے زیادہ منافع نہ لیں گے، جعلی کھاتے نہ رکھیں گے، جھوٹ نہ بولیں گے، خریدار کو مال کا حسن و قبح ٹھیک ٹھیک بتا دیں گے، ناپ تول میں کمی نہ کریں گے وغیرہ۔ پھر اس کا دروازہ ہندو، مسلمان، سکھ، سب کے لیے کھلا رکھیے اور اعلان کر دیجیے کہ ان شرائط پر جو شخص بھی ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہے، ہو سکتا ہے۔

(۲) ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی کشمکش سے اپنے آپ کو قطعاً بالاتر رکھیے۔ اگر کبھی غیر مسلموں سے آپ کو تجارتی شرکت توڑنی پڑے بھی تو اسے قومی جھگڑے کی بنا پر نہ توڑیے بلکہ اصول کی لڑائی لڑ کر توڑیے اور ان سے الگ ہو کر جو تجارتی جمعیت آپ بنائیں اسے بھی کسی ایک قوم کے تاجروں تک محدود نہ رکھیے بلکہ چند معروف اصولوں پر قائم کر کے صلائے عام دیجیے کہ جو ان اصولوں کو قبول کرے وہ ہمارے ساتھ شریک ہو سکتا ہے۔ آپ کی تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہر قوم کے لوگوں کے ساتھ آپ کا زیادہ سے زیادہ سابقہ اور معاملہ پیش آئے، تاکہ آپ اپنی اصولی دعوت کو اور اپنے اخلاقی اثرات کو ہر طرف بے روک ٹوک پھیلا سکیں۔ قوم پرستانہ کشاکش میں اپنا دامن آپ نے الجھا لیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا آپ نے ہر چار دروازوں میں سے تین دروازے اپنے اوپر خود بند کر لیے۔

(۳) اگر کسی وقت آپ دیکھیں کہ سودی معاملات کیے بغیر بڑے پیمانہ پر تجارت نہیں کی جا سکتی تو بجائے اس کے کہ آپ "اضطرار" کے بہانے سودی معاملات کریں، بڑے پیمانے کی تجارت چھوڑ دیجیے اور صرف اُس تھوڑی سی بقدر کفاف آمدنی پر قناعت کیجیے جو اللہ حلال ذرائع سے آپ کو دے۔ آپ کا یہ سوال کہ "کیا ہم اضطراراً بینک سے معاملہ کر لیں؟" بڑا ہی عجیب سوال ہے۔ کیا واقعی بہت کمانے کے لیے بھی آدمی کبھی مجبور و مضطر ہو سکتا ہے؟ کوئی بھوکا مر رہا ہو تو بے شک وہ کہہ سکتا ہے کہ میں حرام کے چند لقمے حاصل کرنے پر مجبور ہوں، مگر کھاتا پیتا آدمی کہے کہ میں حرام کے ہزاروں روپے کمانے پر مجبور ہوں تو یہ بالکل ایک نرالی قسم کی مجبوری ہو گی۔ ایسے حیلوں سے حرام کو اپنے لیے حلال کرنے کا تصور بھی آپ کے ذہن میں کبھی نہ آنا چاہیے۔ پھر ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ اپنے اصولوں کی اس قدر "شورا شوری" کے بعد اگر آخر کار آپ نے یہ بے تکی دکھائی کہ ذرا سے تجارتی مفاد کو نقصان پہنچتے دیکھ کر بینک کے دروازے پر توبہ توڑ بیٹھے تو آج تک آپ نے جو کچھ کیا ہے اس سب پر کس بری طرح پانی پھر جائے گا۔ یہ حرکت کر کے تو گویا آپ خود ہی یہ ثابت کر دیں گے کہ اسلام کے اصول صرف بیان کرنے کے لیے ہیں، برتنے کے لیے نہیں ہیں۔ جو ہندو دوست آپ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں ان کو جواب دیجیے کہ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ، مگر بجائے اس کے کہ ہم آپ کا مشورہ قبول کر کے اپنے اصولوں کے خلاف

سودی کاروبار میں مبتلا ہوں، ہم آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر ایک مرتبہ آپ غیر سودی اصولوں پر لین دین کرنے کا تجربہ کر دیکھیں۔ اس تجربے سے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیز ہمارے اور آپ کے اور سب لوگوں کے لیے سودی کاروبار سے بہتر ہے۔ اگر آپ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم ایک غیر سودی بینک قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ اس کو چلا کر عملاً اس کا فائدہ آپ کو دکھا سکتے ہیں۔

(۲) حکومت سے گرانٹ کی درخواست آپ رکن جماعت ہوتے ہوئے نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر حکومت آپ سے یہ درخواست کرے کہ آپ اس کی گرانٹ قبول کر لیں، اور اس بات کا اطمینان دلائے کہ یہ گرانٹ محض ملکی صنعت کی ترقی کے لیے دینا چاہتی ہے، آپ کا ضمیر خریدنا اس کے پیش نظر نہیں ہے، تو اس درخواست پر ہمدردانہ غور کیا جا سکتا ہے۔

مطبوعات

عربی کا معلم (۳ حصے) | مؤلفہ مولوی عبدالستار خاں صاحب۔ قیمت: حصہ اول ۴؍ حصہ دوم ۳؍ حصہ سوم ۱۲؍

ملنے کا پتہ: مولوی عبدالستار خاں وانباڑی۔ ۸۰ ہانکا منش بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳۔

اس مقبول عام عربی آموز کتاب پر پہلے ترجمان القرآن میں تبصرہ ہو چکا ہے اور مولوی عبدالستار خاں صاحب کی یہ کوشش ہندوستان بھر کے علماء، ادبا اور اساتذہ سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اب مزید کسی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔

یہ کتاب کا تازہ ترین چوتھا اڈیشن ہے۔

کلید جدید برائے عربی کا معلم (۳ حصے) | مؤلفہ مولوی عبدالستار خاں صاحب۔ قیمت حصہ اول ۵؍ دوم ۵؍ سوم ۱۰؍

ملنے کا پتہ: مولوی عبدالستار خاں وانباڑی۔ ۸۰ ہانکا مینش بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳

یہ کلید ان لوگوں کے لیے ہے جو عربی کے قواعد پر بغیر کسی استاد کے محض "عربی کا معلم" کے مطالعہ سے عبور حاصل کرنا چاہیں۔ اس میں قواعد کو محفوظ کرنے کے لیے مفید مشقیں مرتب کی گئی ہیں۔

عربی کا نیا قاعدہ (۲ حصے) | مؤلفہ مولوی عبدالستار خاں صاحب۔ قیمت حصہ اول ۲؍ دوم ۳؍

ملنے کا پتہ:- مذکورہ بالا۔

اس قاعدہ کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس کے پہلے حصہ میں جوڑ کے سارے قاعدے واضح کرنے کے لیے سالم اشکالِ حروف سے بننے والے الفاظ جمع کیے گئے ہیں اور حروف کے شوشوں کا استعمال حصہ دوم میں کیا گیا ہے، تاکہ بچہ ابتدا میں الجھے نہیں۔

نشری تقاریر | از جناب مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ پرنسپل جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن۔ قیمت مجلد ۱۲؍ کلدار۔

ملنے کا پتہ:- ادارہ نشریات اردو، حیدرآباد۔ دکن۔

یہ ۱۵ پندرہ تقاریر ہیں جو سائنس سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر مؤلف نے حیدرآباد کی نشرگاہ سے پیش کی ہیں۔ ان میں پڑھنے والے کے لیے اچھی معلومات جمع ہیں۔

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ	
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	لائحہ عمل	(زیر طبع)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۳	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ	فی -/۶/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور (پاکستان)

نئی کتابیں

اشتراکیت اور نظام اسلام

تالیف

محمد مظہر الدین صدیقی صاحب

"ہیگل ۔ مارکس اور نظام اسلام" کا تیسرا ایڈیشن

بہت سے اضافوں کے ساتھ

ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت چار روپے آٹھ آنہ

اشتراکیت اور اسلام

تالیف

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

اشتراکیت پر علمی تنقید ۔ اسلام کے نظام معاشی کی تشریح

دوسرا ایڈیشن

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

ذیلدار پارک ، اچھرہ ۔ لاہور

سرورق مطبوعہ رپن پریس لاہور